اسلام
اور
انتہا پسندی

Islam & Extremism

مولانا وحید الدین خاں



E-mail: fathima-sarah@hotmail.com
positivethinkersforum@rediffmail.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سوال

آج مسلمانوں میں ایسی جماعتیں اور گروہ موجود ہیں جن کا دعویٰ ہے کہ اسلام میں توحید پر زور زیادہ دیا گیا ہے۔لہٰذا جماعت اور تنظیم توحید کے اتفاقی مسئلہ پر اٹھانی چاہیئے اور یہ تنظیمیں اور جماعتیں اپنے زعم کے مطابق توحید کے اتفاقی مسئلے پر کام کر رہی ہیں۔

یہ لوگ قرآن کی تمام توحید والی آیتوں کو عوام کے سامنے پیش کر کے کہتے ہیں کہ اے لوگو! توحید کو اختیار کرو اور شرک کو چھوڑو۔اس کائنات میں کوئی داتا' دستگیر' حاجت روا' مشکل کشاہ اور غوث الاعظم وغیرہ نہیں' سوائے مالکِ کائنات کے۔

اس طرح یہ لوگ قرآن کی تمام اُن آیتوں کو جن میں شرک کی مذمت بیان ہوئی ہے پیش کر کے کہتے ہیں کہ چونکہ یہ کلمہ پڑھنے والے شرک کرتے ہیں اور شرک کی موجودگی میں نیک اعمال قبول نہیں ہوتے۔لہٰذا ہم موحد لوگ اُن قبر پرستوں (بریلیوں اور شیعوں' وغیرہ) کے پیچھے نہ نماز پڑھیں گے اور نہ ان کی نمازِ جنازہ پڑھیں گے۔

مسلمانوں کے اس طرح کے دعووں کو سامنے رکھتے ہوئے چند سوالات پیش خدمت ہیں۔امید ہے آپ تسلی بخش جواب دیں گے۔

۱) کلمہ پڑھنے کے بعد اگر شرک ہوتا رہے تو کیا ایسے شخص پر مشرک کا اطلاق ہوگا؟

۲) مسلم اور مشرک کی تعریف کیا ہے؟ کیا مسلمان مشرک ہو سکتا ہے؟

۳) مسلمانوں میں جو لوگ واضح شرک کرتے ہیں ان کی اقتداء میں صلوٰۃ پڑھنے کی کیا دلیل ہے جب کہ یہ بھی حقیقت ہے کہ مشرک کے اعمال قبول نہیں ہوتے۔

۴) جب مشرک امام کی اپنی صلوٰۃ نہیں ہوتی تو موحد مقتدی کی نماز کیسے ہوگی؟

۵) امتِ مسلمہ کے بہت سے علماء اس بات کے قائل ہیں کہ سورہ یوسف کی آیت ۱۰۶ کی روشنی میں کلمہ پڑھنے والے بھی مشرک ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا ان کے پیچھے نماز نہ پڑھی جائے۔

۶) جب شراب کا پینے والا شرابی کہلائے گا تو شرک کرنے والا مشرک کیوں نہیں کہلایا جائے گا؟

۷) کلمہ پڑھنے کے بعد اگر ایک ہندو مندر جاتا ہے تو یہ کام اس کے مسلمان ہونے میں رکاوٹ ہوگا اور اسے بدستور ہندو سمجھا جائے گا۔ لیکن اگر دوسرا شخص کلمہ کا اقرار کرنے کے بعد قبر کا طواف کرتا رہے تو یہ عمل اس کے اسلام میں رکاوٹ کیوں نہیں بنے گا اور ایسا شخص مشرک کیوں نہیں ہوگا۔

۸) آپ کے لٹریچر اور کتابوں میں میں نے قبر پرستی اور شرک کے پہلوؤں پر اتنا زیادہ زور نہیں دیکھا جتنا زور توحیدی ٹائپ کے لوگ لگاتے ہیں۔ اس فرق کی وجہ کیا ہے؟ جب کہ آپ بھی شرک کے مخالف ہیں، بلکہ سخت ترین مخالف۔

(عبداللطیف، کراچی، پاکستان)

جواب

اختلاف کی بُرائی جو موجودہ مسلمانوں میں پائی جاتی ہے اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ مسلم جماعتیں توحید کے بجائے کسی اور عنوان پر کام کر رہی ہیں۔ اختلاف کا اصل سبب صرف ایک ہے اور وہ انتہا پسندی (extremism) ہے۔ موجودہ زمانہ کی مسلم جماعتیں کسی نہ کسی پہلو سے انتہا پسندی کا طریقہ اختیار کئے ہوئے ہیں۔ کوئی اعتقادی انتہا پسندی کا شکار ہے، کوئی سیاسی انتہا پسندی کا، کوئی مسائلی انتہا پسندی کا، کوئی گروہی انتہا پسندی کا، کوئی کسی اور انتہا پسندی کا۔ یہی انتہا پسندی موجودہ نزاعات کا اصل سبب ہے۔ انتہا پسندی کو قرآن اور

حدیث میں غلو کہا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ایا کم والغلو فی الدین فانما ھلک من کان قبلکم بالغلو فی الدین (النسائی، ابن ماجہ، مسند احمد) یعنی تم غلو سے بچو کیوں کہ پچھلی امتیں غلو ہی کی سبب سے ہلاک ہوئیں۔

غلو یا انتہا پسندی کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ کسی بات کو اس کی آخری منطقی حد (logical extreme) تک لے جایا جائے۔ اور پھر اس کی بنیاد پر انتہائی احکام صادر کئے جائیں۔ اس کی ایک مثال خود آپ کی زیر نظر تحریر میں موجود ہے۔ توحید پر زور دینا بہت اچھا ہے۔ مگر یہ کہنا اتنا ہی غلط ہے کہ "یہ کلمہ پڑھنے والے مسلمان چونکہ شرک کرتے ہیں اور شرک کی موجودگی میں نیک اعمال قبول نہیں ہوتے۔ لہٰذا ہم موحّد لوگ ان قبر پرستوں (بریلویوں اور شیعوں وغیرہ) کے پیچھے نہ نماز پڑھیں گے اور نہ ان کی نماز جنازہ میں شریک ہوں گے۔

اسی آخری بات کو حدیث میں غلو کہا گیا ہے اور غلو خود ایک ہلاکت خیز عمل ہے۔ ایک شخص کو علم دین حاصل ہو اور علم دین کی روشنی میں اس نے یہ جانا ہو کہ توحید اسلام میں بنیادی عقیدہ کی حیثیت رکھتی ہے تو ایسے شخص کو حق ہے کہ وہ خیر خواہی کے جذبہ کے تحت لوگوں کو توحید کی طرف بلائے۔ لیکن اس اصلاحی دعوت کے ساتھ اگر وہ یہ حکم لگانے لگے کہ فلاں لوگ چونکہ اس کے نزدیک مشرکانہ اعمال میں مبتلا ہیں اس لئے ان کا بائیکاٹ کیا جائے گا۔ حتیٰ کہ ان کی نماز جنازہ بھی نہیں پڑھی جائے گی تو ایسا شخص خود اسلام کی نظر میں غلط کار قرار پائے گا کیونکہ وہ غلو کر رہا ہے اور غلو کی اسلام میں گنجائش نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اصلاح کا کام ایک بے حد نازک کام ہے۔ اس کی ناگزیر شرطوں میں سے ایک شرط یہ ہے کہ مصلح ایک چیز اور دوسری چیز کے فرق کو جانے۔ اس کو یہ جاننا چاہئے کہ اس کی ذمہ داری صرف پُرامن دعوت ہے یہ اس کی سرے سے ذمہ داری ہی نہیں کہ وہ متعین

طور پر لوگوں کے بارہ میں یہ حکم لگائے کہ فلاں شخص مشرک ہے۔ مصلح کو چاہئے کہ وہ مشرک ہونے کے معاملہ کو خدا کے حوالے کرتے ہوئے اپنے آپ کو صرف خیر خواہانہ نصیحت تک محدود رکھے۔ جن لوگوں کے اندر فرق کرنے کی یہ صلاحیت نہ ہو ان کا اصلاح کے میدان میں آنا بذات خود ایک جرم کی حیثیت رکھتا ہے۔ آپکے سوالات کا نمبروار جواب حسب ذیل ہے۔

۱) کلمہ پڑھنے کے بعد اگر شرک ہوتا رہے تو کیا ایسے شخص پر مشرک کا اطلاق ہوگا؟

جواب: کسی مصلح کی ذمہ داری صرف یہ ہے کہ وہ سنجیدگی اور خیر خواہی کے ساتھ شرک کے مسئلے کو بتائے۔ کسی مصلح کا یہ کام نہیں کہ وہ کسی متعین شخص کو مشرک قرار دے اور اس کے اوپر شرک کے احکام نافذ کرنے کی کوشش کرے۔ پہلا کام یقینی طور پر جائز ہے مگر دوسرا کام یقینی طور پر جائز نہیں۔ جو لوگ ایسا کریں وہ مفسد ہیں نہ کہ مصلح۔

۲) مسلم اور مشرک کی تعریف کیا ہے؟ کیا مسلمان مشرک ہو سکتا ہے؟

جواب: مشرک کسی قوم یا نسل کا نام نہیں۔ کسی بھی شخص سے شرک کا فعل سرزد ہو سکتا ہے۔ مگر تعین کے ساتھ کسی کو مشرک قرار دینے کا حق صرف خدا کو ہے، انسان کو نہیں۔

۳) مسلمانوں میں جو لوگ واضح شرک کرتے ہیں ان کی اقتداء میں صلوٰۃ پڑھنے کی کیا دلیل ہے جب کہ یہ بھی حقیقت ہے کہ مشرک کے اعمال قبول نہیں ہوتے۔

جواب: کوئی مقتدی امام کی نماز نہیں پڑھتا۔ ہر مقتدی خود اپنی نماز پڑھتا ہے۔ امام کے سبب سے کسی مقتدی کی نماز نہ مقبول ہوتی ہے اور نہ غیر مقبول۔ قبولیت کا تعلق تمام تر ہر آدمی کی اپنی نیت سے ہے۔ باجماعت نماز کا مقصد صرف اجتماعیت ہے۔ جس امام کے پیچھے بھی

اجتماعیت کا یہ مقصد حاصل ہو جائے وہ درست قرار پائے گا۔ یہ بات حدیث میں ان الفاظ میں کہی گئی ہے: **الصلاۃ المکتوبۃ واجبۃ خلف کل مسلم، برّا کان او فاجراً وان عمل الکبائر** (سنن ابی داوٗد، **کتاب الصلاۃ باب امامۃ البرّ والفاجر**) یعنی فرض نماز ہر مسلمان کے پیچھے واجب ہے، خواہ وہ نیک ہو یا بد اور خواہ اس نے کبیرہ گناہ کیا ہو۔

یہاں اگر کوئی یہ نکتہ نکالے کہ حدیث میں فاجر یا مرتکب کبائر کا لفظ ہے، اس میں مشرک کا لفظ نہیں تو یہ بھی اسی غلو کی ایک صورت ہوگی جس کا اوپر ذکر کیا گیا۔ اس قسم کے غلو کرنے والوں پر فرض ہے کہ وہ چُپ رہیں، نہ کہ اس قسم کے فتنہ انگیز الفاظ بول کر امت میں نزاع پیدا کریں۔

۴) جب مشرک امام کی اپنی صلوٰۃ نہیں ہوتی تو موحد مقتدی کی نماز کیسے ہوگی؟

جواب: کس مصلی کی نماز ہوئی اور کس مصلی کی نماز نہیں ہوئی، اس کا فیصلہ کرنے کا اختیار تمام تر اللہ تعالیٰ کو ہے۔ جو لوگ کسی مصلی کی نماز پر ہونے یا نہ ہونے کا حکم لگائیں وہ اپنی حد سے تجاوز کرتے ہیں اور حد سے تجاوز کرنا بلاشبہ سخت گناہ ہے۔

۵) امتِ مسلمہ کے بہت سے علماء اس بات کے قائل ہیں کہ سورہ یوسف کی آیت ۱۰۶ کی روشنی میں کلمہ پڑھنے والے بھی مشرک ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا انکے پیچھے نماز نہ پڑھی جائے۔

جواب: کلمہ پڑھنا صرف اسلام میں داخلہ کا اعلان ہے۔ کلمہ کا یہ مطلب نہیں کہ آدمی شرک کے ارتکاب سے ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو گیا۔ فتنہ کی اس دنیا میں کوئی بھی شخص شرک میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ مصلح کا کام مشرک کی نشاندہی کرنا اور اس پر حکم لگانا نہیں ہے بلکہ عمومی انداز میں شرک کا مسئلہ بتانا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا طریقہ یہ تھا کہ آپ کو جب اصلاحی

خطاب کرنا ہوتا تو آپ ﷺ فرماتے: **مابال اقوام یفعلون کذا و کذا** ۔(لوگوں کو کیا ہو گیا کہ وہ ایسا اور ایسا کرتے ہیں)۔

٦) جب شراب کا پینے والا شرابی کہلائے گا تو شرک کرنے والا مشرک کیوں نہیں کہلایا جائے گا؟

جواب: ایک شخص اگر شراب پیتا ہو تو مصلح کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ اس کے شرابی ہونے کا اعلان کرے اور اس کو کوڑا مارنے کا فتویٰ دے۔ مصلح کا کام صرف یہ ہے کہ وہ کامل خیر خواہی کے ساتھ شرابی کو نصیحت کرے اور برابر نصیحت کرتا رہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص بظاہر شرک میں مبتلا ہے تو مصلح کو چاہئے کہ وہ خیر خواہانہ انداز میں اس کو سمجھائے۔ مصلح کو اس کا حق نہیں کہ وہ برسرعام تعین کے ساتھ کسی کے مشرک ہونے کا اعلان کرے اور اس کے خلاف فتوی جاری کرے۔ یہ سب دینی اصتلاح میں غلو کے کام ہیں اور اسلام میں غلو کی سخت ممانعت کی گئی ہے۔

٧) کلمہ پڑھنے کے بعد اگر ایک ہندو مندر جاتا ہے تو یہ کام اسکے مسلمان ہونے میں رکاوٹ ہو گا اور اسے بدستور ہندو سمجھا جائے گا۔ لیکن اگر دوسرا شخص کلمہ کا اقرار کرنے کے بعد قبر کا طواف کرتا رہے تو یہ عمل اس کے اسلام میں رکاوٹ کیوں نہیں بنے گا اور ایسا شخص مشرک کیوں نہیں ہو گا۔

جواب: اس معاملے میں مسلم اور نو مسلم دونوں کا حکم ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ اصلاح کی ہمدردانہ کوشش دونوں کے ساتھ کی جائے گی۔ مگر تعین کے ساتھ شرعی حکم لگانے کا کام کسی کے خلاف بھی نہیں کیا جائے گا۔

۸) آپ کے لٹریچر اور کتابوں میں میں نے قبر پرستی اور شرک کے پہلوؤں پر اتنا زیادہ زور نہیں دیکھا جتنا زور توحیدی ٹائپ کے لوگ لگاتے ہیں۔ اس فرق کی وجہ کیا ہے؟ جب کہ آپ بھی شرک کے مخالف ہیں، بلکہ سخت ترین مخالف۔

جواب: پیغمبر کا طریقہ یہ ہے کہ سارا زور روحِ دین کو زندہ کرنے پر لگایا جائے۔ خارجی اعمال ہمیشہ داخلی روح کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ خارجی اعمال سے اپنے آپ داخلی روح پیدا ہو جائے۔

تکفیر و تفسیق کا موجودہ طریقہ جو مسلمانوں میں ایک عرصہ سے رائج ہے وہ سراسر باطل ہے، شریعت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ مذموم طریقہ عباسی سلطنت کے زمانے میں رائج ہوا اور ''فرق ضالہ'' کے نام پر وہ کئی سو سال تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ یہ نوبت آگئی کہ ان فتوؤں کے مطابق، امتِ مسلمہ میں کوئی بھی شخص مومن و مسلم کی حیثیت سے باقی نہ رہا۔ آخر کار علماء نے اتفاقِ عام کے ساتھ یہ فیصلہ کیا کہ تکفیر و تفسیق کے اس کام کو بند کر دیا جائے۔ علماء نے اتفاق رائے کے ساتھ یہ اعلان کیا کہ: **لا نکفر احداً من اهل القبلة** (ہم کسی ایسے شخص کو کافر نہیں کہیں گے جو قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھے)۔

یہی اس معاملہ میں صحیح مسلک ہے۔ **قرون مشهود لها بالخير** میں اس قسم کا تکفیری مشغلہ نہیں ملتا۔ یہ تکفیری مشغلہ عباسی دور میں قدیم عراق میں متکلمین نے پیدا کیا۔ مگر بعد کو علمائے راسخین نے اس کو رد کر دیا اور یہ متفقہ فیصلہ کیا کہ کسی بھی حال میں اہل قبلہ کی تکفیر نہیں کی جائے گی۔

اہل قبلہ کی شرط اسی قسم کی ایک چیز ہے جس کو تعلیق بالمحال کہا جاتا ہے۔ کوئی بھی فرقہ کبھی ایسا نہیں کرے گا کہ وہ کعبہ کے بجائے کسی مندر یا چرچ کی طرف نماز پڑھے۔ پچھلے ہزار سال کے دوران کبھی کسی فرقہ نے ایسا نہیں کیا۔ ایسی حالت میں لانکفر احداً من اهل القبلة کا

مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ کوئی شخص جو اپنے آپ کو مسلمان کہے ہم بھی اس کو مسلمان کہیں گے۔ ہم اپنی طرف سے کسی کو کافر نہیں بتائیں گے۔

تکفیر و تفسیق کی ممانعت کی مطلب یہ نہیں ہے کہ بُرائی کے معاملہ میں لوگوں کو بے عمل یا غیر جانبدار بنا دیا جائے۔ اس کا مطلب عمل کے صحیح رخ کو بتانا ہے۔ اور وہ یہ کہ بُرائی کے معاملے میں ہمارا طریقہ خیر خواہانہ نصیحت کا ہونا چاہئے۔ بقیہ چیزوں کو اللہ کے اوپر چھوڑ دینا چاہئے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں نے اپنے رب سے دعا کی کہ وہ میری امت کو قحط سے ہلاک نہ کرے۔ اللہ نے میری یہ دعا قبول کرلی۔ اور میں نے دعا کی کہ وہ میری امت پر کسی دشمن کو مسلط نہ کرے۔ اللہ نے میری یہ دعا قبول کرلی۔ اور میں نے یہ دعا کی کہ وہ ان کو گروہوں میں نہ بانٹے کہ ان کا ایک گروہ ان کے دوسرے گروہ کو اپنی طاقت کا مزہ چکھائے۔ اللہ نے اس کو قبول نہیں کیا۔ (مسند احمد الجزء ۵، صفحہ ۲۴۸)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کسی تحریک کے غیر مطلوب ہونے کی پہچان کیا ہے۔ وہ پہچان یہ ہے کہ کیا اس تحریک کے ذریعہ مسلمان دو حصوں میں بٹ کر ایک دوسرے سے لڑ رہے ہیں۔ جب بھی کسی تحریک کا یہ نتیجہ نکلے کہ مسلمان دو گروہوں میں بٹ کر ایک دوسرے سے ٹکرانے لگیں، تو یقینی طور پر ایسی تحریک ایک غیر مطلوب تحریک ہے۔ اس کو خدا کی مدد حاصل نہیں۔ ایسی تحریک کا اگر پھیلاو ہو تو یقینی طور پر یہ پھیلاؤ شیطان کی مدد سے ہوگا نہ کہ اللہ کی مدد سے۔

دو گروہوں میں بٹنے کا یہ معاملہ سیاسی عنوان سے بھی ہوسکتا ہے اور مذہبی عنوان سے بھی یا کسی اور عنوان سے بھی۔ کسی مسلم تحریک کے مطلوب ہونے کی اصل پہچان یہ نہیں ہے کہ وہ قرآن وحدیث کے نام پر اٹھائی گئی ہے۔ بلکہ اصل پہچان یہ ہے کہ اس کے نتیجہ میں مسلمانوں کے اندر اتحاد فروغ پا رہا ہے یا اختلاف۔ جس تحریک کے ذریعہ مسلمانوں میں اتحاد فروغ پائے وہ خدا کی مطلوب تحریک ہے اور جس تحریک کے ذریعہ مسلمانوں میں تفریق و اختلاف فروغ پائے وہ خدا کے نزدیک غیر مطلوب تحریک ہے۔

یہ اختلاف

ہفتہ وار "انکشاف" (جھانسی ۲۱ دسمبر ۱۹۸۳ء) میں ایک مختصر مضمون نظر سے گذرا:

یہ سنیوں کی مسجد ہے۔

یہ شیعوں کی مسجد ہے۔

یہ اہل حدیث کی مسجد ہے۔

یہ بریلویوں کی مسجد ہے۔

یہ دیوبندیوں کی مسجد ہے۔

یہ مسجد بساطیان ہے۔

یہ مسجد منصوریان ہے۔

اس مسجد میں سلام پڑھنا منع ہے۔

اس مسجد میں تبلیغی جماعت قیام نہیں کرسکتی۔

میں ایک نومسلم ہوں۔ قرآن کی تعلیمات سے متاثر ہوکر میں نے اسلام قبول کیا ہے۔ اب کوئی مجھے بتائے کہ میں کس مسجد میں نماز ادا کروں"۔

یہ ایک چھوٹی سے تصویر ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موجودہ زمانے میں مسلمانوں کی حالت کیا ہے۔ مسلمان ہر طرف جھوٹے نعروں میں الجھے ہوئے ہیں اور خود ساختہ مسائل کی بنیاد پر انہوں نے خدا کے ایک دین کو بہت سے دینوں پر بانٹ رکھا ہے۔

ایک شخص اپنے جسم کے کپڑے کو پھاڑ کر اس کے ۲۷ ٹکڑے کر ڈالے تو لوگ اس کو پاگل کہیں گے۔ مگر جن لوگوں نے خدا کے دین کو متفرق کر کے اس کو ۲۷ ٹکڑوں میں بانٹ رکھا ہے وہ پاگل ہی نہیں بلکہ مجرم ہیں۔ ایسے لوگ دینداری کا انعام نہیں پاسکتے۔ البتہ یہ اندیشہ ہے کہ ان کو خدا کے دین کو بگاڑنے والا قرار دے کر ان پر مقدمہ چلایا جائے۔

موجود زمانے میں مسلمانوں کا جو حال ہے وہ اس آیت کا مصداق ہے جو قرآن میں یہودیوں کے بارے میں آئی تھی...... انہوں نے دین کو اپنے درمیان ٹکڑے ٹکڑے کرلیا۔ ہر گروہ کے پاس جو ہے وہ اسی پر خوش ہے (فتقطعوا امرھم بینھم زبرا کل حزب بمالدیھم فرحون' (المومنون ۵۳)

بے معنی مسائل

حدیث میں آیا ہے: ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم نہی عن الاغلوطات ۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اغلوطات سے منع کیا ہے۔اغلوطات سے مراد وہ مسائل ہیں جو واقع ہونے سے پہلے فرضی طور پر قائم کئے جاتے ہیں۔(ھی المسائل التی لم تقع)۔ دوسری حدیث میں ارشاد ہوا ہے:ان اللہ کرہ لکم قیل و قال و کثرۃ السوال و اضاعۃ المال ۔ اللہ نے تمہارے لئے قیل وقال کو اور کثرت سوال کو اور مال ضائع کرنے کو ناپسند کیا ہے۔

یہ تعلیم بے حد حکمت پر مبنی ہے۔اگر لوگوں کے اندر کے یہ مزاج باقی نہ رہے تو وہ ہر بات کو بحث کا موضوع بنائیں گے' ہر چیز کو منطق کے پیمانے سے ناپیں گے۔اس کے نتیجے میں یہ ہوگا کہ دین کا اصل سرا چھوٹ جائے گا اور بے معنی مسائل پر لفظی بحث کے سوا ان کے پاس اور کچھ باقی نہ رہے گا۔خدا کا سادہ دین انسانی اضافوں کے بعد مشکل اور پیچیدہ دین ہو کر رہ جائے گا۔

ایک مثال لیجئے:۔ایک مرتبہ کسی نے ایک آدمی سے پوچھا کیا تم مسلمان ہو؟ اس کی زبان سے نکلا: انا مومن انشاء اللہ (خدا نے چاہا تو میں مومن ہوں)۔یہ بات بحث کی نہ تھی۔مگر ماہرین فقہ نے غیر ضروری طور پر اس کو بحث کا موضوع بنایا۔اب ان کے درمیان یہ بحث چل پڑی کہ اس قسم کا جواب دینا جائز ہے یا ناجائز۔ایک گروہ نے کہا کہ جائز ہے۔کیونکہ کسی کا مومن ہونا یا نہ ہونا خدا کی مشیت ہی پر ہے۔دوسرے گروہ نے کہا کہ ناجائز ہے ۔کیونکہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آدمی کو اپنے ایمان میں شک ہے۔شافعی مسلک کے لوگ اس کے قائل تھے کہ انا مومن انشاء اللہ کہنا جائز ہے۔اس کے برعکس حنفی مسلک کے لوگوں کا کہنا تھا کہ ایسا کہنا جائز نہیں۔جب یہ بحث بڑھی تو یہ سوال پیدا ہو گیا کہ ایسے لوگوں کے درمیان نکاح درست ہوگا یا نہیں۔ایک گروہ نے کہا کہ حنفی عورت کا نکاح شافعی مرد کے ساتھ جائز نہیں۔کیونکہ اس کو اس کے ایمان پر شک ہے۔(لا یصح لانھا تشک فی ایمانھا)دوسروں کا فتوی یہ تھا ذمی عورت پر قیاس کرتے ہوئے نکاح درست ہوگا (یصح قیاسا علی الذمیۃ)

اس سے اندازہ کیجئے کہ غیر ضروری بحثوں میں پڑنے کے بعد صراط مستقیم کا سرا کس طرح چھوٹ جاتا ہے۔

ایک آیت

قرآن (المائدہ ۴۴) میں ہے کہ اور جو کوئی اس کے موافق فیصلہ نہ کرے جو اللہ نے اتارا ہے تو وہی لوگ کافر ہیں (ومن لم یحکم بما انزل الله فاولئک هم الکافرون)

ان الفاظ سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ماانزل اللہ کے مطابق فیصلہ نہ کرنے سے آدمی کافر ہو جاتا ہے۔ اسی طرح بہت سی حدیثیں ہیں جن میں بعض اعمال پر کفر کی خبر دی گئی ہے۔ مثلاً رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: سباب المسلم فسوق وقتاله کفر

(مسلم کو گالی دینا فسق ہے اور اس سے جنگ کرنا کفر ہے) البخاری، کتاب الایمان۔

اس طرح کی آیتوں اور حدیثوں کو لے کر کچھ اسلام پسند حضرات ان مسلمانوں کو کافر قرار دیتے ہیں جو ان کے نزدیک ماانزل اللہ پر فیصلہ نہیں کر رہے ہیں۔ اسی نظریہ کے تحت وہ بہت سے مسلم حکمرانوں کو مرتد اور کافر بتاتے ہیں اور ان کے قتل کو جائز قرار دے رہے ہیں۔ اس قسم کا نظریہ بدترین گمراہی ہے اور اس نے عالم اسلام میں خارجیت جیسے ایک فتنہ کو دوبارہ شدید تر صورت میں زندہ کر دیا ہے۔ اس کے نتیجہ میں نہ صرف مسلمان مسلمان کو قتل کر رہے ہیں، بلکہ خود اسلام کی تصویر ایک ایسے مذہب کی ہو گئی ہے جو تشدد اور خوں ریزی کی تعلیم دیتا ہو۔

اس قسم کی آیات اور احادیث کی صحیح تفسیر وہ ہے جو حبر الامت اور امام التفسیر عبد اللہ بن عباسؓ نے کی۔ انہوں نے کہا کہ اس سے مراد وہ کفر نہیں ہے جس سے آدمی خارج از اسلام قرار پاتا ہے۔ بلکہ اس سے مراد کفرٌ دونا کفرٍ ہے۔ یعنی کفر سے کم تر درجہ کا ایک کفر۔ (الترمذی، کتاب الایمان)۔ قرآن وحدیث میں جہاں اس قسم کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں وہ فقہی یا قانونی مفہوم میں نہیں ہیں۔ وہ ایک اسلوب کلام ہے۔ وہ دراصل زجر میں مبالغہ ہے۔ یہ شدت کلام کی ایک مثال ہے۔ اور ناصحانہ کلام میں ہمیشہ اس قسم کا انداز اختیار کیا جاتا ہے، کبھی ایک قسم کے الفاظ میں اور کبھی دوسرے قسم کے الفاظ میں۔ یہ قانونی زبان اور ناصحانہ زبان کا فرق ہے نہ کہ فقہی معنوں میں مسلم اور کافر کا فرق۔

نصیحت اور تنبیہ کبھی سادہ الفاظ میں کی جاتی ہے اور کبھی شدید الفاظ میں۔ مذکورہ مثالیں اسی نوعیت کی شدید انداز کی مثالیں ہیں۔

بے دھڑک فتویٰ

عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ کا قول ہے کہ ''رسول اللہ ﷺ کے اصحاب میں سے کم از کم ایک سو بیس انصار سے میری ملاقات ہوئی ہے' میں نے دیکھا کہ جب بھی کوئی شخص ان میں سے کسی صحابی سے کوئی مسئلہ دریافت کرتا تو وہ اسے دوسرے صحابی کے پاس بھیج دیتے۔ اس طرح وہ چکر لگاتا ہوا پہلے کے پاس آجاتا''۔

ابوعمرو نے سفیان بن عینیہ اور سحنون بن سعید کا یہ قول بیان کیا ہے کہ ''بے دھڑک فتویٰ دینے والا بہت کم علم کا حامل ہوتا ہے'' (تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو فتاویٰ و مسائل ابن الصلاح)۔

اس کے علاوہ امام مالک' امام شافعی' امام احمد بن حنبل و دیگر ائمہ و محدثین کے بارے میں منقول ہے کہ وہ لوگ فتویٰ دینے میں جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کرتے تھے' بلکہ بہت سی جگہوں پر ''لا ادری'' کہہ کر کام چلا لیتے اور کبھی کبھی ایک مسئلہ کے بارے میں ہفتوں تک غور و فکر کرتے رہتے تھے۔

خصوصاً امام مالک رحمہ اللہ فتویٰ صادر کرنے میں کچھ زیادہ ہی احتیاط برتتے تھے' فتویٰ دینے سے پہلے کافی غور و فکر کرتے اور جنت و جہنم کا تصور کر کے جواب دیتے۔ ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ کبھی کبھی ان سے پچاسوں مسئلے پوچھ لئے جاتے مگر ایک کا بھی جواب نہیں دیتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے ''جب کسی سے سوال کیا جائے تو اسے چاہئے کہ جواب دینے سے پہلے جنت و جہنم کا تصور کرے اور خوب اچھی طرح سوچ لے کہ اسے آخرت میں کیوں کر نجات ملے گی'' (فتاویٰ و مسائل ابن الصلاح)۔

بے فائدہ باتیں

مولانا اشرف علی تھانوی (۱۹۴۳ء۔۱۸۶۳ء) کو ایک شخص نے خط لکھا اور یہ دریافت کیا کہ فلاں شرعی مسئلہ کی حکمت کیا ہے۔ مولانا تھانوی نے جواب میں لکھا: حکمت کا سوال کرنے میں کیا حکمت ہے۔ تم خدا کے فعل کی حکمت ہم سے پوچھتے ہو، ہم خود تمہارے فعل کی حکمت تم سے پوچھتے ہیں۔

بہت سے لوگوں کا یہ عجیب مزاج ہوتا ہے کہ وہ غیر ضروری سوالات کرتے رہتے ہیں۔ انہیں اس کی توفیق نہیں ہوتی کہ اپنا احتساب کریں، اپنی ذمہ داریوں پر دھیان دیں۔ البتہ خارجی مسائل میں موشگافیاں نکالنے اور ان کی حکمتیں معلوم کرنے کا انہیں بہت شوق ہوتا ہے۔ یہ ذہن قطعاً غیر اسلامی ہے۔ جن لوگوں کا ذہنی ڈھانچہ اس قسم کا بن جائے وہ کبھی حق کو پانے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

کمانے اور گھر بنانے کا معاملہ ہو تو ہر آدمی اپنے بارے میں سوچتا ہے۔ ہر آدمی کو سب سے زیادہ فکر یہ ہوتی ہے کہ اس کی کمائی اچھی ہو جائے اور اس کا مکان اچھا بن جائے۔ مگر دین اور آخرت کا معاملہ ہو تو ہر آدمی ایسے مسائل پر بحث کرنا پسند کرتا ہے جس کا تعلق اس کی اپنی ذات سے نہ ہو۔

ایک بزرگ جنہوں نے ایک بڑے ادارہ میں ۳۰ سال فتویٰ نویسی میں گذارے تھے، انہوں نے کہا کہ اس پوری مدت میں ہمارے پاس جو استفتاء آتے رہے وہ زیادہ تر دوسروں کے بارے میں تھے اپنے بارے میں بہت کم ہم سے کسی نے سوال کیا۔ فلاں کی جائیداد میں میرا کتنا حصہ بنتا ہے۔ فلاں شخص جو ایسا اور ایسا ہے اس کے پیچھے نماز جائز ہے یا ناجائز، وغیرہ۔ اس قسم کے سوالات تو بہت آتے رہے مگر کسی نے ہم سے یہ نہ پوچھا کہ اس کی اپنی شرعی ذمہ داریاں کیا ہیں۔ وہ اپنے صاحبِ معاملہ کے حقوق کس طرح ادا کرے۔ وہ اپنے پڑوسیوں کے درمیان کس طرح رہے۔ وہ اختلاف اور شکایت کے موقع پر لوگوں سے کس قسم کا سلوک کرے۔ فلاں شخص جس کو وہ ستا رہا ہے اس کو ستانا اس کے لئے جائز ہے یا ناجائز ہے۔ فلاں آدمی جس کا اس نے پیسہ دبا رکھا ہے وہ اس کو دبانا چاہئے یا نہیں دبانا چاہئے۔ فلاں شخص جس کو وہ بے عزت کر رہا ہے وہ اس کے لئے درست ہے یا نہیں۔ آدمی دوسروں میں گم رہتا ہے حالانکہ اس کو اپنے آپ میں گم ہونا چاہئے۔ وہ خارجی مسائل میں جیتا ہے حالانکہ اس کو اپنے اندرونی مسائل میں جینا چاہئے۔ وہ دوسروں کے دین وایمان کو ناپتا ہے حالانکہ اس کو وہ پیمانہ حاصل کرنا چاہئے جس میں وہ اپنے دین وایمان کو ناپ سکے............ باہر دوڑنے والے بدجانور کی خبر ہر ایک کو ہے مگر اپنے دماغ میں بغض اور انتقام کے جو بدجانور بسیرا لئے ہوئے ہیں اس کی خبر کسی کو نہیں۔ عبادت گاہ کے باہر کا تماشا ہر ایک کو دکھائی دے رہا ہے مگر عبادت کے اندر ہونے والا تماشا کسی کو نظر نہیں آتا۔

فتویٰ ایکٹوزم یا ایجوکیشنل ایکٹوزم

آج کل مختلف قسم کے ایکٹوزم (activism) کا چرچا ہے۔ مثلاً پولٹکل ایکٹوزم، سوشل ایکٹوزم، ملّی ایکٹوزم اور میڈیا ایکٹوزم، وغیرہ۔ انہیں میں سے ایک وہ ہے جس کو جوڈیشل ایکٹوزم (judicial activisim) کہا جاتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ پبلک انٹرسٹ (مفادِ عامہ) کے کاموں میں عدالت سے رجوع کر کے اس کا حکم حاصل کرنا، قانون کی مدد سے مفادِ عامہ سے تعلق رکھنے والے مقاصد کو حاصل کرنے کی کوشش کرنا۔ جوڈیشل ایکٹوزم کا یہ طریقہ سیکولر طبقے کے لوگوں کے یہاں رائج ہے۔

اسی طرح مسلمانوں کے کچھ مذہبی طبقے نے کچھ عرصے سے وہ طریقہ اختیار کر رکھا ہے جس کو فتویٰ ایکٹوزم کہا جاسکتا ہے۔ یہ لوگ مسلمانوں کی اصلاح کے مقصد کیلئے فتوے کا طریقہ اختیار کر رہے ہیں۔ مثلاً کسی لباس کو غیر دینی لباس بتا کر اس کے خلاف فتویٰ دینا، کسی مشروب کو غیر اسلامی مشروب بتا کر اس کے حُرمت کا فتویٰ جاری کرنا، کسی مذہبی مقام پر عورتوں کے جانے کو ممنوع قرار دینے کیلئے فتویٰ جاری کرنا، کسی کو پیغمبر کی شان میں گستاخی کرنے والا بتا کر اس کے قتل کا فتویٰ صادر کرنا، کسی مصنف کو متنازعہ قرار دے کر یہ فتویٰ جاری کرنا کہ اس کی کتابیں نہ پڑھو، کسی کو مرتد قرار دے کر اس کے خلاف بائکاٹ کا فتویٰ جاری کرنا، ٹیلی ویژن یا اسی قسم کی اور چیزوں کو حرام قرار دے کے ان سے اجتناب کرنے کا فتویٰ دینا، بینکنگ اور اسی طرح دوسری نئی چیزوں کو غیر اسلامی قرار دے کر اس کے عدم استعمل کا فتویٰ دینا وغیرہ۔

اس قسم کے فتوے موجودہ زمانے میں ہزاروں کی تعداد میں دیئے گئے ہیں مگر سب کے سب بے اثر ثابت ہوئے ہیں۔ ان میں سے ہر فتوے کا صرف یہ انجام ہوا کہ وہ مطلوب نتیجہ پیدا نہ کرسکا۔ پورے جدید دور میں مجھے صرف ایک واقعہ معلوم ہے جب کہ مفتی نے استفتا کے باوجود فتویٰ دینے سے انکار کر دیا۔ یہی طریقہ میرے نزدیک صحیح طریقہ تھا۔

برٹش دَور میں، دہلی میں، ایک عالم تھے ان کا نام مولانا عبد الحق حقانی (وفات ۱۸۳۱)

تھا۔انہوں نے قرآن کی ایک تفسیر لکھی تھی جو ''تفسیر حقانی'' کے نام سے مشہور ہے۔ان کے زمانے انگریزی حکومت نے سونا چاندی کے سکّے کی جگہ کاغذی نوٹ جاری کئے ۔ یہ کاغذی نوٹ روایتی فقہی مسئلے کے اعتبار سے بظاہر غیر اسلامی تھے ۔ مولانا عبدالحق حقانی سے یہ فتویٰ پوچھا گیا کہ کاغذی نوٹ کا طریقہ اسلامی نقطہ نظر سے جائز ہے یا ناجائز۔انہوں نے اس استفتا پر کوئی فتویٰ نہیں دیا' انہوں نے صرف یہ کہا کہ...... میرا فتویٰ نہیں چلے گا اور نوٹ چل جائے گا۔اس طرح کے معاملے میں یہی صحیح اسلامی طریقہ ہے۔

فتویٰ کا لفظی مطلب رائے (opinion) ہے۔فتویٰ کی دو صورتیں ہیں ۔ایک یہ کہ کوئی شخص خود اپنے بارے میں پوچھے کہ مجھے فلاں معاملہ درپیش ہے۔میں اس میں کیا کروں۔ مثلاً ایک خاتون کھلاڑی اپنے ڈریس کے بارے میں پوچھے کہ کھیل کے دوران مجھے اسلامی نقطہ نظر سے کون سا ڈریس استعمال کرنا چاہئے ۔ایسی حالت میں فتویٰ دینا درست ہے۔ یہ وہ حالت ہے جب کہ فتویٰ پوچھنے والا خود اپنے بارے میں حکم کی پیروی کی نیت سے مفتی سے سوال کرے۔ایسی حالت میں مفتی کو فتویٰ پوچھنے والے کا جواب دینا چاہئے۔فتوے کا صحیح استعمال اور اس کا درست محل یہی ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ سماج میں ایک بُرائی موجود ہے۔اس کے بارے میں خود سماج کی طرف سے کوئی سوال نہ کیا جا رہا ہو۔ایک شخص ذاتی طور پر اُس سماجی مسئلے کو لے کر اس کے متعلق' استفتاء مرتب کرے اور اس کے بارے میں مفتی سے فتویٰ پوچھے۔اس صورت میں اگر مفتی فتویٰ دیتا ہے تو وہ فتوے کا غلط استعمال کرتا ہے۔ایسا فتویٰ مثبت معنوں میں کوئی اصلاح تو پیدا نہیں کرے گا' البتہ وہ اسلام کی بدنامی کا سبب بن جائے گا۔

مثال کے طور پر کئی سماجی برائیاں ہیں جن کے خلاف مفتی صاحبان نے موجودہ زمانے میں فتوے دیئے ہیں۔مگر مولانا عبدالحق حقانی کی زبان میں' یہ ہوا کہ ان کا فتویٰ تو نہیں چلا' البتہ برائیاں بدستور جاری رہیں۔مثلاً بدعات کے خلاف فتویٰ' مشرکانہ رسموں کے خلاف فتویٰ' شادیوں میں جہیز کے خلاف فتویٰ' ٹی وی اور سنیما کے خلاف فتویٰ' لاؤڈ اسپیکر کے خلاف

فتویٰ، بینک انٹرسٹ کے خلاف فتویٰ، داڑھی نہ رکھنے کے خلاف فتویٰ، مغربی لباس کے خلاف فتویٰ، انگریزی تعلیم کے خلاف فتویٰ، وغیرہ۔ جیسا کہ معلوم ہے، یہ تمام فتوے بے نتیجہ ہوکر رہ گئے، معاشرے کے اوپر ان کا کوئی اثر نہیں پڑا۔

میرے مطالعے کے مطابق، اس معاملے میں صحیح بات یہ ہے کہ صرف صاحبِ معاملہ کو اپنے بارے میں استفتا کا حق ہے اور اسی طرح کے معاملے میں مفتی کو فتویٰ دینا چاہئے۔ مثلاً اگر کوئی شخص مفتی کے پاس اس قسم کا استفتا بھیجے کہ فلاں مسجد کے امام کی داڑھی چھوٹی ہے تو کیا ایسے امام کے پیچھے مقتدیوں کی نماز ہوتی ہے یا نہیں۔ اس قسم کا استفتا ایک فتنہ ہے نہ کہ حقیقتاً کوئی استفتا۔ مفتی کو چاہئے کہ وہ ایسے استفتا کا جواب نہ دے۔ استفتا کا تعلق، فتویٰ پوچھنے والے کے ذاتی معاملے سے ہے نہ کہ اس کی ذات کے باہر دوسروں کے معاملے سے۔

اب سوال یہ ہے کہ عمومی اصلاح یا معاشرتی اصلاح کے بارے میں اسلام کا طریقہ کیا ہے۔ یہ طریقہ تذکیر اور نصیحت کا طریقہ ہے نہ کہ فتوے کا طریقہ۔ یعنی تحریر اور تقریر کے ذریعے لوگوں کو سمجھانا۔ سمجھانے کے یہ کام ''قولِ بلیغ'' کی زبان میں ہونا چاہئے۔ یعنی ایسی زبان اور دلیل جو سننے والے کے دل میں اُتر جائے۔ یہاں تک کہ وہ اس کی صداقت کا اعتراف کر لے۔

نصیحت اور تذکیر کے اس طریقے کو آج کل کی زبان میں ایجوکیشنل ایکٹوزم کہا جاسکتا ہے۔ یعنی تعلیم اور تربیت کے ذریعے لوگوں کی اصلاح کرنا لوگوں کے ذہن کو بدلنے کی کوشش کرنا۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اصلاحِ معاشرہ کے بارے میں اسلام کا اصول ایجوکیشنل ایکٹوزم پر مبنی ہے نہ کہ فتویٰ ایکٹوزم پر۔

اس معاملے میں ایک رہنما مثال وہ ہے جس کا ذکر صحیح البخاری میں آیا ہے۔ حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ اسلام کے ابتدائی زمانے میں قرآن کی جو آیتیں اُتریں ان میں جنت اور جہنم کا ذکر تھا۔ تاکہ لوگوں کے دلوں میں اسلام کے بارے میں نرم گوشہ پیدا ہو اور لوگوں کے اندر ذہنی آمادگی آجائے۔

اس طرح جب قبولیت کی استعداد پیدا ہوگئی تو اس کے بعد قرآن میں اترا کہ زنا چھوڑ دو اور شراب چھوڑ دو۔ ایسا حکم اگر پہلے اترتا تو لوگ اس کی تعمیل نہ کرتے بلکہ وہ یہ کہتے کہ ہم تو زنا نہ چھوڑیں گے، ہم شراب نہ چھوڑیں گے۔ (لاندع الزنا أبداً ولا ندع الخمر أبداً)

اس سے معلوم ہوا کہ عمومی اصلاح کا کام فتویٰ یا حکم جاری کرنے سے نہیں ہوتا، بلکہ اس کام کے لئے سب سے پہلے لوگوں کے اندر قبولیت کی استعداد پیدا کی جاتی ہے اس کے بعد ان کو حکم دیا جاتا ہے۔ استعداد پیدا کئے بغیر حکم دینا کسی بھی درجے میں مسئلے کا کوئی حل نہیں۔

جب بھی کسی معاشرے میں بگاڑ آتا ہے تو اس کا سبب یہ نہیں ہوتا کہ لوگوں کو حکم یا قانون کا علم نہیں ہے، اس لئے لاعلمی کی بنا پر لوگ غلط کاموں میں مبتلا ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ معاشرتی بگاڑ کا سبب لوگوں کے اندر اسپرٹ کی کمی ہوتی ہے نہ یہ کہ وہ حکم اور قانون سے بے خبر ہیں۔

ایسی حالت میں سماج سدھار یا معاشرے کی اصلاح کا نقطہ آغاز یہ نہیں کہ قانونی حکم کو لے کر فتویٰ صادر کیا جائے، بلکہ اس کا نقطہ آغاز یہ ہے کہ لوگوں کے اندر اسپرٹ کو جگایا جائے، لوگوں کے اندر شعور کو زندہ کیا جائے، لوگوں کے اندر مادہ قبولیت پیدا کیا جائے۔ جب یہ کام قابلِ لحاظ حد تک ہو جائے اس کے بعد وہ وقت آتا ہے جب کہ لوگوں کو حکم اور قانون کی زبان میں مسائل سے آگاہ کیا جائے۔ داخلی استعداد پیدا کرنے سے پہلے، خارجی احکام کا اعلان کرنا ایک غلط ترتیب ہے۔ یہ گھوڑے کے آگے گاڑی باندھنا ہے جو کہ یقینی طور پر قابلِ عمل نہیں۔

فتویٰ ایکٹوزم ہو یا دوسرا کوئی ایکٹوزم، ہر ایک کو جانچنے کا طریقہ صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ عملی طور پر اس کا نتیجہ کیا نکلنے والا ہے۔ کسی عمل کی درستگی کو جاننے کا ذریعہ صرف اس کا صحیح نتیجہ ہے۔ یہ ایک مسلّم اصول ہے کہ عمل کو ہمیشہ نتیجہ رخی عمل (result-oriented action) ہونا چاہئے۔ اور فتویٰ ایکٹوزم بلاشبہ اس اصول عام سے مستثنیٰ نہیں۔

فتویٰ کا غلط استعمال

ریاست جموں اور کشمیر میں اکثر فوج اور تشدد پسندوں کے درمیان ٹکراؤ ہوتا ہے۔ ایسے موقع پر تشدد پسند لوگ عموماً ایسا کرتے ہیں کہ وہ مذہبی عمارتوں میں داخل ہوکر وہاں پناہ لے لیتے ہیں اور وہاں سے اپنی کارروائیاں کرتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں دونوں طرف سے گولیاں چلتی ہیں اور فطری طور پر مذہبی عمارت کو نقصان پہنچتا ہے۔ یہ صورتِ حال وادی کے مدرسے اور مسجد اور درگاہ وغیرہ میں عرصے سے جاری ہے۔

ہندوستانی فوج نے اس صورتِ حال کے پیش نظر عرصے سے کشمیر میں 'سد بھاونا آپریشن' کے نام سے ایک مہم چلا رکھی ہے۔ اُن کے پاس گورنمنٹ آف انڈیا کا فنڈ ہوتا ہے۔ وہ لوگ اس کی مدد سے مسجد اور مدرسہ اور خانقاہ کی عمارتوں میں ٹوٹ پھوٹ کی مرمت کرتے ہیں اور اُس کو پھر سے درست کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ کام کشمیر میں کئی سالوں سے جاری ہے۔

جون 2007 میں سری نگر کے علاقہ راجوری کدل میں علما کی ایک کانفرنس ہوئی۔ اس میں کشمیری مسلمانوں کے مذہبی رہ نما 350 کی تعداد میں شریک ہوئے۔ یہاں انھوں نے فتویٰ یا بیان کی صورت متفقہ طور پر ایک ریزولیشن پاس کیا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ مسجد کی مرمت غیر مسلموں کے ہاتھ سے کرنا، اسلام میں حرام ہے۔ اس لئے سد بھاؤنا آپریشن کا یہ کام دین میں مداخلت کی حیثیت رکھتا ہے، گورنمنٹ آف انڈیا کو چاہئے کہ وہ اس کام کو فوراً بند کرے۔

یہ فتویٰ یا بیان سرتاسر بے بنیاد ہے، یہ اسلام کو اپنے سیاسی مقصد کے لئے استعمال کرنا ہے، اُس کا اسلامی تعلیمات سے کوئی تعلق نہیں۔ اسلام کی تاریخ میں، اور خود ہندوستان میں ایسا برابر ہوتا رہا ہے کہ غیر مسلم لوگوں کے تعاون سے مسجدیں بنائی گئی ہیں یا اُن کی مرمت کا کام ہوا ہے، مگر علما نے کبھی اس کام کو غلط نہیں بتایا۔

اس معاملے میں سب سے بڑی مثال خود کعبہ کی ہے، جو گویا کہ تمام مسجدوں کا نمائندہ ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے کعبہ یا بیت اللہ کو مکہ میں چار ہزار سال پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بنایا تھا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ساتویں صدی عیسوی کے ربع اول میں ہوئی۔ اُس وقت وہاں کعبہ کی جو نئی عمارت تھی وہ ابراہیمی تعمیر کے مطابق نہ تھی۔

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے کعبہ کی ابراہیمی عمارت بارش کی وجہ سے ڈھ گئی تھی۔ اُس وقت مکہ کے لوگوں نے کعبہ کی دوبارہ تعمیر کی۔ مکہ کے یہ لوگ مشرک اور بُت پرست تھے۔ گویا کہ رسول اللہ کی بعثت کے وقت مکہ میں خانہ کعبہ کی جو عمارت تھی وہ مشرکین کے ہاتھوں بنائی گئی تھی، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی اس پر اعتراض نہیں کیا، یہاں تک کہ ہجرت کے آٹھویں سال جب مکہ فتح ہو گیا اور رسول اللہ کو وہاں کا اختیار حاصل ہو گیا، تب بھی آپ نے ایسا نہیں کیا کہ آپ مشرکین کے بنائے ہوئے کعبہ کو ڈھائیں اور دوبارہ اس کو اہل ایمان کے ذریعے تعمیر کرائیں۔

تاریخ مزید بتاتی ہے کہ فتح مکہ کے وقت کعبہ کے اوپر جو غلاف تھا، وہ مشرکین کا بنایا ہوا تھا۔ اُس کو بنانے میں بت پرستوں کا مال استعمال ہوا تھا، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ پر فتح حاصل کرنے کے باوجود اس قدیم غلاف کو نہیں بدلا۔ بعد کو ایسا ہوا کہ ایک عورت کی غلطی سے یہ غلاف جل گیا۔ اس کے بعد آپ نے نیا غلاف تیار کر کے اس کے اوپر ڈالا۔ گویا کہ غلاف کی تبدیلی صرف اُس وقت کی گئی جب کہ یہ تبدیلی ایک ناگزیر ضرورت بن گئی تھی۔

تاریخ میں اس طرح کے بہت سے واقعات ہیں جو واضح طور پر یہ بتاتے ہیں کہ مسجد یا مدرسے میں غیر مسلم کا تعاون لینا عین جائز ہے، اس میں کسی بھی قسم کا کوئی حرج نہیں۔ ایسے فعل کو دین میں مداخلت کہنا، سرتاسر غلط ہے، بلکہ وہ فتنہ انگیز ہے۔ کیوں کہ اس سے مسلم اور غیر مسلم کے درمیان تعلقات غیر ضروری طور پر بگڑ سکتے ہیں۔

کسی مسجد یا مدرسے کی بلڈنگ بذاتِ خود مسجد یا مدرسہ نہیں ہے، وہ صرف مسجد یا مدرسے کا ظاہری ڈھانچہ ہے۔ مسجد اصلاً عبادت کا مقام ہے اسی طرح مدرسہ اصلاً تعلیم کا مقام ہے۔ ظاہری ڈھانچے کے بارے میں اس قسم کے فتوے یا بیانات، اسلام کی روح کو سخت نقصان پہنچانے والے ہیں۔ اس سے غیر ضروری طور پر ساری اہمیت ڈھانچے کی بن جاتی ہے۔ حالاں کہ صحیح یہ ہے کہ عبادت اور تعلیم کو اہمیت دی جائے۔ سارا زور اور تاکید بہتر عبادت اور بہتر تعلیم پر ہو۔ ڈھانچے کے بارے میں اس قسم کی باتیں کرنا، لوگوں کے ذہن کو بگاڑنا ہے۔ اور ذہن کو بگاڑنا، اسلام میں ایک جرم کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس قسم کا منفی ذہن مسلمانوں کے اندر کیوں پیدا ہوا، اس کا سبب صرف ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ مسلمانوں نے موجودہ زمانے میں دعوت کا مزاج کھودیا۔ دوسری اقوام ان کے لئے مدعو نہ رہیں، بلکہ وہ ان کی حریف اور رقیب بن گئیں۔ اسی منفی مزاج کا نتیجہ ہے جو کہ مذکورہ قسم کی نامحمود چیزوں کی صورت میں برآمد ہو رہا ہے۔

صحیح مسلم مزاج وہ ہے جس کو دعوتی مزاج کہا جاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں مسلمانوں کا جو موجودہ مزاج ہے وہ قومی مزاج ہے نہ کہ دعوتی مزاج۔ دعوت، دوسرے انسانوں تک خدا کا ابدی پیغام رحمت پہنچانے کا نام ہے۔ اس قسم کا مشن اپنے آپ داعی کو دوسرے انسانوں کا ہمدرد اور خیر خواہ بنا دیتا ہے۔ یہ مشن آدمی کے اندر دوسرے انسانوں کے لئے محبت کے جذبات پیدا کرتا ہے۔ یہ مشن آدمی کو دوسرے انسانوں کے حق میں نرم اور شفیق بنا دیتا ہے۔

قومی مزاج کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ قومی مزاج آدمی کے اندر دوسروں کے خلاف رقیبانہ مزاج پیدا کر دیتا ہے۔ قومی مزاج ہمیشہ مادّی مفادات کی بنیاد پر بنتا ہے۔ اس قسم کے مزاج میں دوسروں کے لئے شکایات ہوتی ہیں، نہ کہ ہمدردی اور خیر خواہی۔ آج کل مسلمانوں کے اندر عام طور پر یہی قومی مزاج بن گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دوسروں کے بارے میں منفی نفسانیت میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ یہ منفی مزاج اُن کے تمام مسائل کا اصل سبب ہے۔

کلچرل ہیرٹیج کا پریزرویشن

کلچرل ہیرٹیج (cultural heritage) اُسی چیز کا دوسرا نام ہے جس کو عام طور پر ہسٹاریکل مانیومنٹ (historical monument) کہا جاتا ہے۔ مقامی ریفرنس کے اعتبار سے وہ کلچرل ہیرٹیج ہے اور یونیورسل ریفرنس کے اعتبار سے وہ ہسٹاریکل مانومنٹ۔ کلچرل ہیرٹیج یا ہسٹاریکل مانیومنٹ کی اہمیت اسلامی ٹریڈیشن میں بھی وہی ہے جو دوسرے ٹریڈیشن یا ڈسپلن میں مانی جاتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کلچرل ہیرٹیج کا پریزرویشن (preservation) انسانیت کے ان عمومی معاملات میں سے ہے جس میں سکولر پوائنٹ آف ویو اور اسلامک پوائنٹ آف ویو کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ اسلام کے مطابق بھی وہ بلاشبہہ اس قابل ہے کہ اسکو پریزرو کیا جائے۔ ماضی کے ریکارڈ کو اگر محفوظ نہ رکھا جائے تو مستقبل کی نسلوں کیلئے علم کا ایک معتبر ذریعہ ضائع ہو جائے گا۔ یہ ایک ایسا تاریخی نقصان ہے جسکی تلافی کسی اور ذریعے سے ممکن نہیں۔

اسلام فطرت کا دین ہے۔ ہر وہ چیز جو فطرت اور ریزن کے مطابق قابل لحاظ ہو وہ یقیناً اسلام میں بھی قابل لحاظ قرار پائے گی۔ کسی چیز کا فطری تقاضا ہونا بجائے خود اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اسلام کا تقاضا بھی ہے۔

اسلامی شریعت میں ایک اہم اور مسلمہ اصول یہ ہے کہ: **الاصل فی الاشیاء الاباحة** (چیزوں میں اصل ان کا مباح ہونا ہے) اس شرعی اصول کی روشنی میں دیکھئے تو کلچرل ہرٹیج کو پریزرو کرنا یقینی طور پر اسلام میں ایک جائز کام ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ قرآن اور سنت میں کہیں بھی یہ حکم نہیں دیا گیا ہے کہ کلچرل ہرٹیج کو پریزرو نہ کرو۔ اور جب قرآن اور سنت میں اس قسم کی کوئی ممانعت موجود نہیں تو کلچرل ہرٹیج کو پریزرو کرنا اپنے آپ جائز قرار پائے گا۔ اس عمل کو جائز ٹھہرانے کے لئے مزید کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔

تاہم قرآن کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ کلچرل ہیریٹیج کی اہمیت کے بارے میں ایسے حوالے بھی موجود ہیں جو اس کی اہمیت کو ثابت کرنے کیلئے براہ راست ثبوت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہاں اس سلسلے میں اسلامی ماخذ سے چند متعلق حوالے درج کئے جاتے ہیں۔

۱۔ قرآن میں اس سلسلے کی ایک آیت یہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: تم میرے پاس اس سے پہلے کی کوئی کتاب لے آؤ یا کوئی علم جو چلا آتا ہو (46:4) قرآن کی اس آیت میں '' اثرۃ من علم '' کا مطلب (remnant of knowledge) ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس سے مراد وہی چیز ہے جس کو آج کل کی زبان میں آرکیالوجیکل ریکارڈ یا ہسٹاریکل ریکارڈ کہا جاتا ہے۔

اس قسم کا ریکارڈ ماضی کے واقعات کو جاننے کے لئے نہایت اہم علمی ذریعہ ہے۔ ایسی حالت میں ماضی کے اس ریکارڈ کو محفوظ رکھنا انتہائی ضروری ہے، علمی نقطہ نظر سے بھی اور اسلامی نقطہ نظر سے بھی۔

2- کلچرل ریکارڈ یا ہسٹاریکل کو محفوظ رکھنے کی ایک عملی مثال قرآن میں وہ ہے جو فرعون کے تذکرہ کے ذیل میں آئی ہے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ موسیٰ کا ہم عصر فرعون جب غرق ہو کر مرا تو اللہ تعالیٰ نے اس سے فرمایا کہ...... آج ہم تمہارے بدن کو محفوظ رکھیں گے تاکہ وہ تمہارے بعد والوں کے لئے نشانی ہو (10:92)

جیسا کہ معلوم ہے، مذکورہ فرعون کا جسم مصری رواج کے مطابق، مرنے کے بعد مومیائی کر کے ایک اہرام میں رکھ دیا گیا تھا۔ یہ بلاشبہہ قدیم مصری کلچر کا ایک حصہ تھا۔ مصری کلچر کا یہ حصہ خود خدا کے منصوبے کے تحت محفوظ رہا، یہاں تک کہ انیسویں صدی کے آخر میں اس کو مصر کے ایک اہرام سے نکالا گیا۔ اور کاربن ڈیٹنگ کے جدید طریقہ کو اپلائی کر کے یہ معلوم ہوا کہ وہی فرعون ہے جو حضرت موسیٰ کے زمانے میں غرق ہوا تھا۔ فرعون کا یہ محفوظ جسم قاہرہ کے

میوزم میں قرآن کی مذکورہ آیت کی ایک شہادت کے طور پر آج بھی رکھا ہوا ہے۔

جیسا کہ معلوم ہے، فرعون ایک مشرک بادشاہ تھا۔ اس کے باوجود اللہ کی مرضی یہ ہوئی کہ اس کے جسم کو محفوظ رکھا جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کلچرل ہسٹری کی نہ صرف عام چیزیں بلکہ مشرک بادشاہ کا جسم بھی محفوظ کیا جا سکتا ہے۔ اس پر قیاس کرتے ہوئے یہ کہنا درست ہوگا کہ بامیان میں واقع بودھ کے دو ہزار سالہ مجسموں کو محفوظ رکھنا اسلام میں بھی اُسی طرح مطلوب ہے، جس طرح دوسرے ٹریڈیشن یا ڈسپلن میں مطلوب ہے یا ہوسکتا ہے۔

3- قرآن میں نبی اسرائیل کی تاریخ کے ذیل میں بتایا گیا ہے کہ ان کے یہاں ایک وراثتی تابوت (صندوق) موجود تھا جو نسل در نسل ان کے یہاں ذریعۂ سکون کے طور پر محفوظ رہا۔ اس تابوت میں آل موسیٰ اور آل ہارون کے تبرکات محفوظ کئے گئے تھے۔ گویا یہ عین وہی چیز تھی جس کو موجودہ زمانے میں کلچرل ہیریٹیج کہا جاتا ہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وراثتی تابوت کو اتنی زیادہ اہمیت حاصل تھی کہ ایک موقع پر اس کو فرشتے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے گئے۔ (2:248)

میں سمجھتا ہوں کہ کلچرل ہیریٹیج کو محفوظ کرنے کی یہ ایک براہ راست مثال قرآن میں موجود ہے۔ اس کلچرل ہیریٹیج کی اہمیت بھی ثابت ہوتی ہے اور یہ بھی کہ ایسی چیز کو نسل در نسل محفوظ رکھنا شریعت الٰہی کے خلاف نہیں۔

4- قرآن میں مومن کی ایک صفت 'السائح' بتائی گئی ہے (9:112) یعنی سیاحت کر کے زمین کے مختلف مقامات پر جانا اور پچھلی قوموں کے چھوڑے ہوئے آثار و مساکن کو دیکھ کر ان سے نصیحت لینا (28:58)۔ قرآن میں بتکرار یہ آیت آئی ہے: قل سیروا فی الارض ثم انظروا کیف کان عاقبة المکذبین (6:11)

اس کے مطابق، اسلام میں یہ مطلوب ہے کہ ماضی کے تاریخی آثار کو اس کی ابتدائی شکل

میں محفوظ رکھا جائے تا کہ دیکھنے والے لوگ ان سے سبق لے سکیں۔ تاریخی آثار کو محفوظ نہ رکھنے کی صورت میں اسلام کا یہ سیاحتی مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔

5- کلچر ہمیشہ ایک طبقہ یا ایک کمیونٹی کی وراثت ہوتا ہے۔ ہر کمیونٹی کو یہ مطلق رائٹ حاصل ہے کہ وہ اپنے کلچر کا تحفظ کرے۔ کلچر کے معاملے میں نہیں دیکھا جائے گا کہ وہ اسلام کے موافق ہے یا اس کے خلاف۔ جب بھی کوئی کمیونٹی کسی کلچر کو اپنا کلچر سمجھے اور اس کو محفوظ رکھنا چاہے تو یہ حق اس کو دیا جائے گا۔ یہ حق جس سیکولرزم میں تسلیم کیا گیا ہے اس طرح وہ اسلام میں بھی تسلیم شدہ ہے۔

اس کی ایک مثال یہ ہے کہ اسلام کے خلفیہ ثانی عمر فاروق کی خلافت کے زمانے میں یروشلم (ایلیا) فتح ہوا تو خود عمر فاروق مدینہ سے سفر کر کے یروشلم گئے۔ اس وقت اسلامی خلافت اور مسیحی فرقہ کے درمیان جو معاہدہ ہوا اس میں دوسری باتوں کے علاوہ یہ بھی لکھا گیا کہ مسیحی چرچوں میں جو چیزیں ہیں وہ محفوظ رہیں گی۔ مثلاً مریم اور مسیح کے بت، وہ مقدس لکڑی جس پر مسیحی عقیدہ کے مطابق، حضرت مسیح کو سولی دی گئی، وغیرہ (تاریخ الطبری) اس قسم کی چیزیں مسیحی کلچر کا حصہ تھیں مگر معاہدہ میں یہ لکھا گیا کہ مسیحی فرقہ کو یہ حق ہوگا کہ ان کے چرچ ڈھائے نہ جائیں اور ان کے کلچرل ہریٹیج کو کسی قسم کا نقان نہ پہنچایا جائے۔ وہ جس طرح چاہیں اپنے کلچر کی حفاظت کریں۔

خلیفہ ثانی کے اس عمل سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہر قوم کو یہ حق حاصل ہے کہ جس چیز کو وہ اپنے کلچر کا حصہ سمجھتی ہے اس کو وہ محفوظ رکھے خواہ وہ مسلم حکومت کے اندر ہو یا مسلم حکومت کے باہر۔ کسی حکومت کو یہ حق نہیں کہ وہ کسی گروہ کے کلچر کے معاملے میں دخل دے۔ کلچر کے تحفظ کا معاملہ حکومتی مداخلت سے آزاد معاملہ ہے۔

6- اس سلسلے میں ایک اہم بات یہ ہے کہ بین الاقوامی اہمیت کی چیزوں میں اسلام کا

نارم (norm) بھی وہی ہوگا جو دوسری قومون کا متفقہ نارم ہو۔ انٹر نیشنل نارم کے معاملے میں اسلام کا یہ اصول پیغمبر اسلام کے بعض واقعات سے مستنبط ہوتا ہے۔

مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری زمانے میں یمن کے ایک شخص مسیلمہ نے نبوت کا دعویٰ کیا۔ اس نے دو آدمیوں پر مشتمل اپنا ایک وفد رسول اللہ کے پاس مدینہ بھیجا اور یہ کہلوایا کہ آپ میری نبوت کو قبول کریں۔ پیغمبر اسلام نے ان دو آدمیوں سے پوچھا کہ مسیلمہ کے معاملے میں تمہاری اپنی رائے کیا ہے۔ دونوں نے کہا کہ ہم بھی اس کو اس دعویٰ کے مطابق' نبی مانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اگر یہ رواج نہ ہوتا کہ سفیروں کو قتل نہیں کیا جاتا تو میں ضرور تم دونوں کو قتل کر دیتا (سیرت ابن ہشام)

پیغمبر اسلام کے اس ارشاد سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی چیز انٹر نیشنل طور پر تسلیم کر لی جائے تو اسلام میں بھی اس کو تسلیم کیا جائے گا۔ اس اصول کی روشنی میں کلچرل ہیریٹج کو محفوظ کرنا اسلام میں بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ دوسری قوموں کے نزدیک اہم ہے۔ جدید دنیا میں کلچرل ہیریٹج یا ہسٹاریکل مانیومنٹ کو نہایت اہمیت کے ساتھ محفوظ کیا جاتا ہے۔ اسلام میں بھی بلاشبہہ ایسا ہی کیا جائے گا۔ اس معاملے میں دوسروں سے الگ اسلام کا کوئی طریقہ نہیں۔

پیغمبر اسلام مکہ میں پیدا ہوئے۔ وہاں کھجور کے درخت نہیں ہوتے تھے۔ اس کے بعد آپ ہجرت کر کے مدینہ آئے۔ یہاں کھجوروں کے باغ ہوا کرتے تھے۔ ایک دن آپ ٹاؤن سے باہر ایک باغ کے پاس سے گزرے۔ یہاں کچھ لوگ کھجور کے درخت پر چڑھ کر اپنے ہاتھوں سے ہینڈ پالی نیشن (hand pollination) کا کام کر رہے تھے۔ آپ نے انہیں ایسا کرنے سے منع کر دیا۔

اگلے سال کھجور کی فصل کم آئی۔ آپ نے سبب پوچھا تو لوگوں نے بتایا کہ آپ نے پالی

نیشن (تأبیرنخل) سے منع کر دیا تھا جب کہ اسی سے کھجور میں اچھی فصل آتی ہے۔ یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ تم جو کرتے تھے اس کو کرو، کیونکہ تم اپنی دنیا کے معاملے میں زیادہ جانتے ہو (أنتم اعلم بأمور دنیاکم)

پیغمبر کے اس قول سے ایک اہم اصول معلوم ہوتا ہے اور وہ ہے عقیدہ اور امور دنیا کا فرق۔ اسلام کے مطابق زندگی کے وہ معاملات جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے امور دنیا سے تعلق رکھتے ہیں ان کو عقیدہ کے تابع نہیں رکھا جائے گا، بلکہ ایسے موضوعات علمی ریسرچ کے تابع ہوں گے۔ ان میں وہی چیز درست قرار پائے گی جو علمی ریسرچ سے درست قرار پاتی ہو۔ ایگری کلچر اور ہارٹی کلچر سے لے کر انجنیئر نگ اور ہسٹری کے شعبے تک سب اس میں شامل ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ کلچرل ہریٹیج یا ہسٹاریکل مانیومنٹ کے پریزرویشن کا معاملہ بھی انہیں چیزوں میں سے ہے جو علمی ریسرچ کے تابع ہیں نہ کہ عقیدہ (faith) کے تابع۔

خلاصہ یہ کہ اصولی ہدایات اور عملی نظائر دونوں اعتبار سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کلچرل ہیریٹیج یا ہسٹاریکل مانیومنٹ کے پریزرویشن کے معاملے میں اسلام کی رائے بھی وہی ہے جو دوسرے ٹریڈیشن یا ڈسپلن کی ہے۔ بالفرض اگر کسی مسلم ملک میں کوئی مانیومنٹ ایسا ہو جس کو کسی بنا پر ملک کے اندر رکھنا مناسب نہ ہو تو ایسی حالت میں اس کو تباہ نہیں کیا جائے گا بلکہ خواہش مند قوموں اور ملکوں کو اسے ایکسپورٹ کر دیا جائے گا تا کہ وہ اس کو اپنے میوزیم میں محفوظ کر سکیں۔

افغانستان (بامیان) میں گوتم بدھ کے مجسموں کو جس طرح توڑا گیا وہ ہرگز اسلام نہ تھا، وہ غلو (ایکسٹریمزم) تھا اور قرآن اور حدیث کے مطابق، غلو (ایکسٹریمزم) اسلام میں نہیں۔ (تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو راقم الحروف کی کتاب ''ہند۔ پاک ڈائری'' صفحہ: 247)

کفر اور کافر کا مسئلہ

بیسویں صدی میں کمیونسٹ نظریہ بڑے پیمانہ پر ساری دنیا میں پھیلا۔ اس کے تحت انسانی سماج کو دو طبقوں میں بانٹ دیا گیا۔ ایک محنت کش طبقہ (working class) اور دوسرا بورژوا طبقہ۔

بورژوا (bourgeois) ایک فرانسیسی لفظ ہے۔ یہ لفظ اپنے ابتدائی مفہوم کے اعتبار سے متوسط طبقہ کے لئے بولا جاتا تھا۔ مگر مارکسی فلسفہ کے زیر اثر وہ ایک تحقیری (derogatory) لفظ بن گیا۔ اس نظریہ کے تحت سماج دو طبقوں میں بٹ گیا۔ ایک محنت کش طبقہ جو ہر اعتبار سے معصوم طبقہ کی حیثیت رکھتا تھا اور دوسرا بورژوا طبقہ جو مارکسی تصور کے مطابق' سرمایہ دار طبقہ (capitalist class) کے ہم معنیٰ تھا اور جو مارکس کے مطابق' ہر قسم کی سماجی اور اقتصادی بُرائی کی جڑ تھا۔

ایسا ہی کچھ معاملہ کافر کے لفظ کے ساتھ پیش آیا ہے۔ کافر کا لفظ ابتدائی طور پر صرف ایک سادہ مفہوم رکھتا تھا۔ لغوی اعتبار سے کافر کے معنیٰ ہیں' انکار کرنے والا۔ مگر بعد کے زمانہ میں کافر کا لفظ ایک تحقیری لفظ (derogatory word) بن گیا۔ موجودہ زمانہ میں نظری اعتبار سے یہ غالباً مسلم اور غیر مسلم کے درمیان سب سے بڑا نزاعی مسئلہ ہے جس سے موجودہ زمانہ کے مسلمان دوچار ہیں۔ ایک مثال سے اس معاملہ کی وضاحت ہوگی۔ اقبال کا خاندان پہلے ایک برہمن خاندان تھا۔ بعد کو وہ لوگ اسلام میں داخل ہو گئے۔ اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہ اقبال نے اپنے ایک شعر میں کہا ہے:

مرا بنگر در ہندوستاں دیگر نمی بینی   برہمن زادہ ٔ دانائے رمز روم و تبریز است

اس شعر میں برہمن زادہ کا لفظ سننے والوں کو بُرا نہیں لگتا۔ ابتدائی مفہوم کے اعتبار سے برہمن زادہ اور کافرزادہ دونوں ہم معنیٰ الفاظ ہیں۔ لیکن اگر اقبال کے اس شعر کو بدل کر اس طرح کہا جائے:

کہ کافرزادہء دانائے رمز روم وتبریز است

اگر شعر میں تبدیلی لائی جائے تو تمام اقبال پسند لوگ غصہ ہو جائیں گے۔ کیونکہ برہمن ایک سادہ لفظ ہے جب کہ کافر استعمال کے اعتبار سے ایک تحقیری لفظ بن گیا ہے۔

کمیونٹس اور بورژوا کی تقسیم نے بیسویں صدی میں غیر کمیونسٹ دنیا کو کمیونسٹ لوگوں سے متنفر کر دیا تھا۔ یہی معاملہ اب مسلمانوں کے ساتھ پیش آیا ہے۔ مسلمانوں کی طرف سے مومن اور کافر کی تقسیم نے غیر مسلم دنیا کو مسلمانوں سے بیزار کر دیا ہے۔ حتیٰ کہ اب اشوک سنگھل اور پروین توگاڑیا جیسے لوگ یہ مانگ کرنے لگے ہیں کہ اسلام پر نظر ثانی کرو اور کافر کے لفظ کو اسلام کی لغت سے خارج کرو۔ جب تک اسلام میں ریفارم نہ لائے جائے، مسلم اور غیر مسلم معتدل طور پر ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔

مگر تجربہ بتاتا ہے کہ یہ مسئلہ صرف اشوک سنگھل اور پروین توگاڑیہ جیسے انتہا پسند لوگوں کا نہیں ہے بلکہ اب وہ خود مسلمانوں کا مسئلہ بن چکا ہے۔ آج کے صنعتی سماج میں مسلم اور غیر مسلم دونوں ایک ساتھ مل کر رہتے ہیں۔ ایسی حالت میں تعلیم یافتہ مسلمان عام طور پر یہ محسوس کر رہے ہیں کہ وہ ''کافر'' کے رواجی تصور کے ساتھ مشترک سماج میں معتدل طور پر نہیں رہ سکتے۔ وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ اسلام نے موجودہ زمانہ میں اپنا ریلیونس (relevance) کھو دیا ہے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسے اسلام کو لے کر وہ آج کے سماج میں عزت کے ساتھ کس طرح رہیں۔

دہلی میں ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمان ہیں۔ان سے اکثر میری ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میری پیدائش اگرچہ مسلمان کے گھر میں ہوئی مگراب اسلام پر میرا عقیدہ باقی نہیں رہا۔وہ کہتے ہیں کہ میرا مذہب ڈیموکریسی (جمہوریت) ہے۔ان کا کہنا ہے کہ اسلام انسانیت کو مومن اور کافر کے دونا مساوی طبقوں میں بانٹتا ہے۔جب کہ ڈیموکریسی سارے انسانوں کو برابر کا درجہ دیتی ہے۔انہوں نے ایک بار مجھ سے کہا کہ میرے یہاں جب کوئی بچہ پیدا ہوگا تو میں اس کے کان میں اذان نہیں دلواؤں گا بلکہ کسی پروفیسر کو بلاؤں گا جو بچہ کے کان میں کہے گا......ڈیموکریسی، ڈیموکریسی، ڈیموکریسی۔

حقیقت یہ ہے کہ کافر کا مسئلہ صرف غیر مسلم لوگوں کا مسئلہ نہیں۔اب جدید سماج میں وہ بڑے پیمانہ پر خود مسلمان کا مسئلہ بن چکا ہے۔ضرورت ہے کہ اس مسئلہ کو گہرائی کے ساتھ سمجھا جائے اور اس کے صحیح مفہوم کو سامنے لایا جائے تا کہ اسلام لوگوں کو وقت کا مذہب معلوم ہو اور مسلم اور غیر مسلم دونوں جدید سماج میں معتدل طور پر دوسروں کے ساتھ رہ سکیں۔

گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ سارا معاملہ غلط فہمی پر مبنی ہے۔رواجی تصور میں یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ کافر اور غیر مسلم دونوں ہم معنیٰ الفاظ ہیں۔جو لوگ مسلمان نہیں وہ سب کے سب کافر ہیں۔یہ بلاشبہ ایک غلط تصور ہے۔حقیقت یہ ہے کہ کافر کا لفظ غیر مسلم کے مترادف نہیں:

The word Kafir is not synonymous with non-Muslim.

داعی اور مدعو کا رشتہ

شریعت کے اعتبار سے، مسلمان کی حیثیت داعی کی ہے اور غیر مسلم کی حیثیت مدعو کی۔یہ رشتہ لازم کرتا ہے کہ داعی اپنی مدعو کے ساتھ ہمشیہ معتدل تعلق قائم رکھے۔کہا جاتا ہے کہ تاجر کو ہمیشہ کسٹمر فرینڈلی (customer friendly) ہونا چاہئے۔اسی طرح داعی کا فارمولا یہ ہونا چاہئے کہ وہ ہمیشہ مدعو فرینڈلی ہو۔

Be always *Mad'u* friendly.

مدعو کے حق میں داعی کے اندر خیر خواہانہ جذبات ہونے چاہئیں۔ اگر داعی کے اندر مدعو کیلئے یہ مطلوب جذبات موجود ہوں تو وہ ہرگز اس کو پسند نہیں کرے گا کہ وہ ایسے الفاظ بولے جس سے مدعو کے دل میں اس کے خلاف نفرت پیدا ہو جائے۔ حتیٰ کہ اگر وہ سچا داعی ہے تو اپنے دل میں بھی وہ ایسی بات نہیں سوچے گا۔ دعوت کا جذبہ نفرت کا قاتل ہے۔ داعی کا دل ایک دردمند دل ہوتا ہے۔ ایسے دل کے اندر محبت اور خیر خواہی کے سوا کوئی اور چیز پرورش نہیں پا سکتی۔

قدیم زمانہ میں آرین لوگ جب انڈیا میں آئے تو یہاں کے مقامی لوگوں کو انہوں نے ملیچھ کہا۔ اسی طرح مسیحی علماء نے مسلمانوں کو اپنی کتابوں میں انفڈل (infidels) لکھا۔ ملیچھ اور انفڈل دونوں تحقیری الفاظ (derogatory words) ہیں۔ کہنے والا ان الفاظ کو بول کر خوش ہوتا ہے مگر جس کے بارے میں یہ لفظ بولا گیا ہے وہ اس کو سخت ناپسند کرتا ہے۔ اس معاملہ میں صحیح طریقہ یہ ہے کہ ایسے الفاظ استعمال کئے جائیں جن میں کوئی تحقیری مفہوم (derogatory sense) نہ ہو بلکہ وہ سادہ طور پر صرف اظہار واقعہ کے ہم معنی ہو۔

بدقسمتی سے اس معاملہ میں مسلم علماء احتیاط کا پہلو اختیار نہ کر سکے۔ وہ اپنی کتابوں میں اور قرآن کے ترجموں میں کافر کے لئے بے تکلف انفڈل کا لفظ استعمال کرنے لگے۔ مثال کے طور پر مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنے انگریزی ترجمہ قرآن میں ''قل یا ایھا الکافرون'' کا ترجمہ ان الفاظ میں کیا ہے:

Say thou: infidels (4:535)

دراصل مسلم علما اور رہنماؤں کی اسی قسم کی غیر احتیاطی باتیں ہیں جن کا نتیجہ یہ ہوا کہ

ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان سخت تناؤ پیدا ہوگیا ہے۔ جس کا نتیجہ مختلف ناخوشگوار صورتوں میں سامنے آتا رہتا ہے۔

یہی غلطی قرآن کے اردو اور فارسی مترجمین نے بھی کی ہے۔ قرآن کے بہت سے ترجمے شائع ہوئے ہیں۔ مگر غالباً صرف ایک مترجم (شاہ عبدالقادر) کو چھوڑ کر تمام مترجمین نے اس معاملہ میں بے احتیاطی کا انداز اختیار کیا ہے۔ "**قل یا ایھا الکافرون**" کے کچھ ترجمے یہاں نقل کئے جاتے ہیں:

بگوائے کافرین	(شاہ ولی اللہ)
کہہ اے کافرو	(شاہ رفیع الدین)
آپ ان کافروں سے کہہ دیجئے	(اشرف علی تھانوی)
کہہ دو کہ اے کافرو	(ابوالاعلیٰ مودودی)
کہہ دو، اے کافرو	(امین احسن اصلاحی)
تو کہہ، اے منکرو	(شاہ عبدالقادر)

اس قرآنی آیت کے تحت اکثر مترجمین نے اسی قسم کے ترجمے کئے ہیں۔ اس آیت میں کافر کا ترجمہ درست نہیں۔ بالفرض وہ خالص لغوی اعتبار سے غلط نہ ہو تب بھی وہ دوسری قوموں کے لئے ایک قابل اعتراض لفظ ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس ترجمہ سے احتراز کیا جائے۔ پھر یہ صرف ترجمہ کی بات نہیں، اسی ترجمہ کی بنیاد پر ذہن بنتا ہے اور تقریر و تحریر میں اس کا اظہار ہوتا ہے۔ اس طرح یہ ترجمہ پوری ملت کی منفی ذہن سازی کا سبب بن جاتا ہے۔ یہ ترجمہ ہم اور وہ (we and they) کا ذہن پیدا کرتا ہے اور اس قسم کا تقسیمی ذہن دعوتی اعتبار سے درست نہیں۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا' غالباً ایک ہی عالم ہیں جنہوں نے قرآن کے ان الفاظ کا درست ترجمہ کیا ہے اور وہ شاہ عبدالقادر دہلوی ہیں۔ شاہ عبدالقادر صاحب کا اردو ترجمہ تمام علماء کے نزدیک نہات مستند مانا گیا ہے۔ انہوں نے مذکورہ آیات کا ترجمہ 'منکرو' کیا ہے۔

قرآن کی سورہ نمبر ۱۰۹ میں "قل یا ایھا الکافرون" (کہو کہ اے منکرو) کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ طرز خطاب پورے قرآن میں صرف ایک بار اسی ایک سورہ میں استعمال ہوا ہے۔ کافر یا کفّار یا کافرون کے الفاظ تو قرآن میں متعدد بار آئے ہیں۔ مگر ایھا الکافرون جیسے متعین خطاب کی صورت میں اس کا استعمال قرآن میں کسی اور مقام پر نہیں ہوا ہے۔

مفسرین کی رائے کے مطابق' یہاں الکافرون میں الف لام عہد کا ہے۔ یعنی وہ ایک گروہ خاص کے لئے مشخص طور پر آیا ہے' نہ کہ عمومی طور پر ہر اس شخص کے لئے جو مسلم گروہ سے باہر ہو۔ ذیل میں کچھ مفسرین کے اقوال درج کئے جاتے ہیں:

(قل یا ایھا الکافرون) المخاطبون کفرة مخصوصون قد علم الله انهم لایؤمنون (تفسیر النسفی)

و عنی بالکافرین قوماً معینین لا جمیع الکافرین (تفسیر القرطبی)

خطاب لجماعة مخصوؤصة (تفسیر المظهری)

قل یا ایھا الکافرون ایک مخصوص خطاب ہے' اس کو عمومی طور پر استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ یعنی قل ایھا الکافرون سے مراد ہمیشہ کے لئے صرف قدیم منکرین قریش رہیں گے جو پیغمبر اسلام کے معاصر تھے اور پیغمبرانہ اتمام حجت کے باوجود جنہوں نے پیغمبر کی بات کو ماننے سے انکار کیا۔ زمانہ نبوت کے بعد کے لوگوں کو ایھا الانسان کے لفظ سے خطاب کیا جائے گا' نہ کہ ایھا الکافرون کے لفظ سے۔ اب یہی انداز خطاب ہمیشہ جاری رہے گا۔ یہاں تک کہ قیامت آجائے۔

کافر کا مفہوم

عربی زبان میں کفر کے معنٰی انکار کے ہیں اور کافر کا مطلب ہے انکار کرنے والا۔ اسلام کے مطابق' کافر ایک کردار ہے' کافر کسی قوم کا اجتماعی لقب نہیں:

Kafir is an individual character rather than a group title of a certain race or community

کافر وہ ہے جو منکر ہو (one who refuses to accept)۔ قرآن کے اردو ترجموں میں سب سے زیادہ صحیح ترجمہ شاہ عبدالقادر دہلوی کا مانا جاتا ہے۔ انہوں نے اپنے ترجمہ قرآن میں کافر کا ترجمہ منکر کے لفظ سے کیا ہے۔ یہی اس لفظ کا صحیح ترجمہ ہے۔ قرآن کے انگریزی مترجمین اکثر کافر کا ترجمہ اَن بلیور (unbeliever) کے لفظ سے کرتے ہیں۔ یہ ترجمہ صحیح نہیں۔ اَن بلیور کا مطلب غیر مومن یا غیر معتقد ہوتا ہے۔ جبکہ کافر کا مطلب صرف غیر معتقد نہیں ہے بلکہ اس سے مراد وہ شخص ہے جو اتمام حجت کے باوجود ماننے سے انکار کرے۔

دور اوّل میں جب قرآن کی ابتدائی آیتیں اتریں تو ان میں پیغمبر کا مخاطبین کو کافر نہیں کہا گیا بلکہ ان کے لئے انسان جیسے الفاظ استعمال ہوئے۔ مثلاً قرآن میں پیغمبر کو خطاب کرتے ہوئے کہا گیا کہ: **یا ایھا الرسول بلغ ما أنزل الیک من ربک**.......... **واللہ یعصمک من الناس** ۔ اس آیت میں دیکھئے۔ یہاں **یعصمک من الناس** (خدا تمہیں لوگوں سے محفوظ رکھے گا) کے الفاظ آئے ہیں۔ ایسا نہیں ہوا کہ یہاں **یعصمک من الکفار** کا لفظ استعمال کیا جائے۔ قرآن میں کثرت سے اس طرح کی آیتیں ہیں جو بتاتی ہیں کہ ہر گروہ کے لئے اصلاً انسان جیسا عمومی لفظ استعمال کیا جائے گا۔ کافر کا لفظ صرف ان افراد تک مخصوص رہے گا جن کے لئے خدا نے خود کافر کا لفظ استعمال کیا ہو۔ کافر کا لفظ ایک خدائی اعلان ہے' وہ انسان کا دیا ہوا خطاب نہیں۔

فعل اور فاعل کا فرق

قرآن کی سورہ نمبر ۱۰۹ کی پہلی آیت یہ ہے: **قل یا ایھا الکفافرون** (الکافرون ۱) اس آیت میں الکافرون سے مراد قدیم مکہ کے منکرین قریش ہیں۔ ان الفاظ میں قریش کے منکرین کے بارہ میں اتمام حجت کے بعد یہ اعلان کیا گیا کہ تم لوگ اللہ کی نظر میں کافر ہو چکے ہو۔ قرآن میں اس طرح تعین اور تشخص کی زبان میں کسی اور گروہ کے کافر ہونے کا اعلان نہیں کیا گیا۔

قرآن میں دوسرے مقامات پر کفر اور کافر کے الفاظ آئے ہیں۔ مثلاً فرمایا: **فمنکم کافر ومنکم مومن** (التغابن ۲) اسی طرح ارشاد ہوا ہے: **فمنھم من آمن ومنھم من کفر** (البقرہ ۲۵۳) ان دوسری قسم کی آیتوں میں فعل کا ذکر ہے مگر متشخص طور پر فاعل کا ذکر نہیں۔ یعنی یہ تو کہا گیا ہے کہ فلاں فعل کا ارتکاب کفر ہے یا فلاں فعل کا ارتکاب کرنے والا خدا کی نظر میں کافر بن جاتا ہے۔ مگر ان دوسری قسم کی آیتوں میں ایسا نہیں کیا گیا ہے کہ کسی گروہ کو متشخص اور متعین کر کے اُس کے بارہ میں یہ اعلان کیا جائے کہ فلاں فلاں گروہ کافر ہیں۔

قرآنی بیان میں اس فرق سے ایک اصول معلوم ہوتا ہے اور وہ اصول یہ ہے کہ یہ کہنے کا حق ہر داعی کو ہے کہ فلاں فعل کا ارتکاب کفر ہے۔ مگر یہ حق کسی بھی داعی یا عالم کو نہیں کہ وہ متشخص طور پہ یہ اعلان کرے کہ فلاں گروہ یا فلاں قوم کافر ہے۔

ایک متوازی مثال سے اس معاملہ کی مزید وضاحت ہوتی ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ: **من ترک الصلاۃ متعمداً فقد کفر**. دوسری حدیث میں یہ الفاظ ہیں کہ **بین العبد و بین الکفر ترک الصلاۃ**۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ئی مسلمان جان بوجھ کر مسلسل نماز ترک کرے تو وہ شریعت کے مطابق' کافر ہو جاتا ہے۔ اس حدیث کو لے کر کوئی مصلح اگر

یہ کرے کہ وہ عمومی طور پر ترغیب وترہیب کے انداز میں مسلمانوں کو نماز کی طرف متوجہ کرے اور ترک صلاۃ کی وعید بتائے تو اس کا ایسا کرنا بالکل جائز ہوگا۔ لیکن اگر کوئی مصلح ایسا کرے کہ وہ نماز نہ پڑھنے والے مسلمانوں کی نام بنام ایک فہرست تیار کرے اور اس فہرست کو لے کر متعین طور پر یہ اعلان کرے کہ فلاں فلاں مسلمان ترک صلاۃ کی بنا پر کافر ہو چکے ہیں تو اس کا ایسا کرنا بالکل غلط ہوگا۔

ٹھیک اسی طرح کوئی داعی یا مصلح قرآن کی آیتوں کو لے کر یہ مسئلہ بیان کرسکتا ہے کہ وہ کون سے اعمال ہیں جن کا ارتکاب کرنے سے کوئی شخص اللہ کی نظر میں کافر ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کا ایسا کرنا اپنی حد سے تجاوز ہوگا کہ وہ غیر مسلم افراد یا گروہوں کے نام لے کر یہ اعلان کرے کہ فلاں فلاں غیر مسلم لوگ کافر ہیں۔

اس معاملہ میں فعل اور فاعل کے درمیان فرق کرنا لازمی طور پر ضروری ہے۔ یہ حق صرف اللہ تعالیٰ کو ہے کہ وہ متعین طور پر فاعل کا اعلان کرے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ اعلان صرف ایک بار قدیم منکرین قریش کے بارہ میں کیا ہے جن کے اوپر پیغمبر نے براہ راست اتمام حجت کیا تھا۔ بقیہ انسانوں کے بارہ میں وہ آخرت میں اعلان فرمائے گا۔ ہمارا کام صرف دعوت دینا ہے، نہ کہ لوگوں کے کافر ہونے کا اعلان کرنا۔

کریڈٹ کا مسئلہ

کافر یا منکر کا لفظ بیک وقت دو کردار سے تعلق رکھتا ہے۔ ایک وہ جس نے کوئی بات پیش کی ہو۔ دوسرا وہ جس نے اس پیش کی ہوئی بات کا انکار کیا ہو۔ ان میں سے ایک کردار کو داعی کہہ سکتے ہیں دوسرے کردار کو مدعو کہہ سکتے ہیں۔

کافر ایک کردار ہے، کافر کسی گروہ کا قومی لقب نہیں۔ کسی گروہ کا کافر قرار پانا ایک بے

حد غیر معمولی واقعہ ہے۔اس کا مطلب ایک کو انکار کی بنا پر ڈس کریڈٹ (discredit) کرنا اور دوسرے کو اس کے دعوتی عمل کی بنا پر کریڈٹ دینا ہے۔اس کریڈٹ اور ڈس کریڈٹ کا یہ معاملہ فتویٰ یا بیان کے ذریعہ نہیں ہوتا۔ یہ ایک نہایت سنجیدہ دعوتی محنت کا طالب ہے۔

اس دعوتی محنت کا معیاری نمونہ پیغمبر اسلام کا تیرہ سالہ مکی دور ہے۔پیغمبر اسلام نے جب مکہ کے لوگوں میں دعوتی کام کا آغاز کیا تو آپ کے خطاب کے الفاظ یہ تھے: **یا ایھا الانسان** ۔ اس طرح تیرہ سال لوگوں کو بحیثیت انسان خطاب کرنے کے بعد جب لوگ جان بوجھ کر انکار پر قائم رہے تو آخر میں قرآن کی یہ آیت اتری: **قل یا ایھا الکفافرون** ۔ اس وقت بھی یہ ایک براہ راست خدائی اعلان تھا، نہ کہ خود پیغمبر کا اپنا خطاب۔

اس اصول کے مطابق، ہندوستان کے ہندو یا دوسرے ملکوں کے غیر مسلم کی حیثیت اسلامی نقطہ نظر سے صرف انسان کی ہے۔ان میں سے کسی کو بھی کافر یا کفار نہیں کہا جا سکتا۔کیوں کہ ہندوؤں اور موجودہ زمانہ کے دوسرے غیر مسلموں پر یہ ضروری شرط پوری نہیں ہوئی کہ انہیں مکّی معیار کی تیرہ سالہ دعوت دی جائے اور وہ پھر بھی انکار کریں۔اسی طرح انہیں منکر قرار دینا بھی درست نہیں۔

مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان جو نزاعات ہیں اور مسلمانوں کو غیر مسلموں کے بارے میں جو شکایتیں ہیں وہ سب کی سب قومی اور مادی ہیں۔ یہ تمام تر اسی طرح کے دنیاوی جھگڑے ہیں جو خود غیر مسلم گروہوں میں ایک دوسرے کے خلاف پیش آتے ہیں ۔ان نزاعات کو کافر اور مسلم کے درمیان دینی نزاع نہیں کہا جائے گا بلکہ اس کو دو گروہوں کے درمیان دنیوی نزاع کہا جائے گا۔ان قوموں پر اتمام حجت کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ مسلمان ان سے ان دنیوی جھگڑوں کو یک طرفہ طور پر ختم کر دیں۔

کفر کا تحقق

کسی شخص کے بارے میں کب یہ متحقق (establish) ہوگا کہ وہ منکر یا انکار کرنے والا بن چکا ہے۔ اس سوال کا جواب خود قرآن میں موجود ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے قرآن کے نزول کا آغاز ۶۱۰ء میں مکہ میں ہوا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کے ذریعہ مکہ کے لوگوں تک توحید کی دعوت پہنچاتے رہے۔ اس دعوتی مہم میں آپ نے کبھی ایسا نہیں کیا کہ اپنے مخاطبین کو کافر کہہ کر خطاب کریں۔ اس دروان میں جو آیتیں اتریں ان سب میں انسان جیسے الفاظ تھے۔ آپ نے انہیں اپنی قوم کا حصہ قرار دیتے ہوئے اپنا پیغام پہنچایا۔

دعوت کی یہ مہم آپ نے اس طرح چلائی کہ آپ گہرے طور پر ان کے خیر خواہ بنے رہے۔ آپ نے ان کی ایذاؤں پر یکطرفہ صبر کیا۔ آپ نے ان سے کسی بھی قسم کا کوئی مطالبہ نہیں کیا۔ آپ نے ان سے کبھی بھی کوئی ایسی بات نہیں کہی جس سے آپ کے اور ان کے درمیان مادّی نوعیت کی کوئی نزاع قائم ہوجائے۔ آپ یک طرفہ طور پر ہمیشہ ان کے خیر خواہ بنے رہے۔ آپ کو ان کی طرف سے طرح طرح کی مصیبتیں پہنچیں مگر آپ ہمیشہ ان کے لئے دعا کرتے رہے۔

دعوت کی یہ صبر آزما جدوجہد تیرہ سال تک چلتی رہی۔ تیرہ سال کے بعد بھی پیغمبر اسلام نے اپنی زبان سے ان کے لئے کبھی کافر کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ آخر میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ آیت اتری کہ: قل یا ایھا الکافرون ۔ (تم کہہ دو کہ اے انکار کرنے والو)۔ اس سے معلوم ہوا کہ پیغمبرانہ معیار کی تیرہ سال کی جدوجہد کے بعد وہ وقت آتا ہے جب کہ مخاطبین کا انکار ثابت ہوجائے اور ان کے بارے میں یہ کہا جا سکے کہ اے انکار کرنے والو۔ اس قسم کے دعوتی کورس سے پہلے کسی کو منکر یا کافر قرار دینا جائز نہیں۔ اب جب کہ

پیغمبرانہ معیار کی تیرہ سالہ جدوجہد کے بعد وہ وقت آتا ہے جب کہ کسی کو کافر یا منکر قرار دیا جا سکے تو عام لوگوں کے لئے تو ایک سو تیرہ سال کی مدت بھی اس کام کے لئے ناکافی ہوگی۔

کفر کی اصطلاح

مکّی دور میں قرآن میں بعض ایسی آیتیں اُتریں جن کا تعلق بیرون عرب کے غیر مسلموں سے تھا۔ مثلاً قرآن کی سورہ نمبر ۳۰ کے آغاز میں رومیوں (عیسائیوں) کا ذکر ہے جو وقتی طور پر ایرانیوں سے مغلوب ہو گئے تھے۔ مگر آیت میں یہ نہیں کہا گیا کہ **غلبت الکفار فی ادنی الارض** (روم کے کفار جو مغلوب ہو گئے ہیں) بلکہ یہ فرمایا کہ **غلبت الروم فی ادنی الارض** (رومی جو مغلوب ہو گئے ہیں)۔ اسی طرح سورہ نمبر ۱۰۵ میں یمن کے غیر مسلم حاکم ابرہہ کا ذکر ہے۔ مگر قرآن میں اس کا ذکر یمن کے ایک کافر حکمراں کے طور پر نہیں کیا گیا بلکہ اصحابِ فیل کے لفظ سے اس کا ذکر کیا گیا۔

قدیم مکہ کے منکرین کے لئے قرآن میں کفر اور کافر کے الفاظ استعمال کئے گئے تھے۔ مگر ایسا نہیں ہوا کہ اس کے بعد اس زمانے کے اہل اسلام تمام غیر مسلموں کو کافر کے لفظ سے پکارنے لگیں۔ مثلاً ہجرت کے بعد رسول اور آپ اصحاب مدینہ آئے تو انہوں نے یہاں کے لوگوں کو کافر کے لفظ سے خطاب نہیں کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یثرب پہنچ کر وہاں کے لوگوں کو جو پہلا خطاب کیا اس میں آپ نے انہیں اے لوگو **ایھا الناس، اتقوا النار ولو بشق تمرة)** کے لفظ سے خطاب کیا۔ اسی طرح مدینہ کے باہر ملک کے اطراف میں بہت سے غیر مسلم قبیلے موجود تھے۔ مگر ان کو بھی کافرانِ عرب یا کافر قبائل کا نام نہیں دیا گیا۔ بلکہ ان کے معروف نام سے انہیں پکارا گیا۔ مثلاً اہل سقیف، اہل نجران، اہل بحرین وغیرہ۔

تاریخ بتاتی ہے کہ دور اول میں اہل اسلام جب عرب سے نکل کر ایشیا اور افریقہ کے ملکوں

میں داخل ہوئے تو یہاں مختلف مذہب کے ماننے والے لوگ آباد تھے۔ دوراول کے مسلمانوں نے ایسا نہیں کیا کہ ان غیر مسلموں کو کافر کے نام سے پکاریں۔ انہوں نے ہر ایک کو اس کے اپنے اختیار کردہ نام سے پکارا۔ مثلاً شام کے مسیحیوں کو مسیحی کہا، فلسطین کے یہودیوں کو یہودی کہا، ایران کے مجوسیوں کو مجوسی کہا، افغانستان کے بودھوں کو بودھ (بوذا) کہا، وغیرہ۔

اسی طرح دوراول کے یہ مسلمان جب ہندوستان آئے تو یہاں بھی انہوں نے یہی کیا۔ انہوں نے یہاں کے لوگوں کو ہندو کہا جو سندھو کا عربی تلفظ ہے۔ ابوالریحان البیرونی (وفات ۱۰۴۸ء) نے ہندوستان کا سفر کیا۔ اس نے سنسکرت زبان سیکھی اور ہندوستان کے بارہ میں ایک عربی کتاب تاریخ الہند لکھی۔ اس میں وہ یہاں کے غیر مسلموں کو ہندو کہتا ہے، نہ کہ کافرانِ ہند۔

ہزار سال سے زیادہ مدت تک یہی رواج باقی رہا۔ اب بھی کثرت سے ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ بقیہ دنیا میں یہی رواج بالفعل قائم ہے۔ مسلمان امریکا اور یورپ کے مختلف ملکوں میں آباد ہیں۔ وہاں ان کا سابقہ غیر مسلم قوموں سے پڑتا ہے۔ مگر ہر ایک کو وہ ان کے اپنے اختیار کردہ نام سے پکارتے ہیں وہ انہیں کافر یا کفار نہیں کہتے۔

چند تاریخی مثالیں

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، قرآن میں **ایھا الکافرون** کے انداز میں خطاب کی مثال صرف منکرین مکہ کے لئے آئی ہے اور وہ بھی تیرہ سال کے پیغمبرانہ اتمام حجت کے بعد۔ منکرین مکہ کے سوا کسی اور کو اس طرح مشخص انداز میں خطاب نہیں کیا گیا۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے جب مکہ میں دعوت کا آغاز کیا تو ابتدائی دور میں آپ نے اس طرح خطاب نہیں کیا کہ **یا ایھا الکفار** ۔ بلکہ قرآن میں یہ آیت اتری: **یا ایھا الانسان**

ماغرّک بربک الکریم ۔ ہجرت کے بعد صحیفۂ مدینہ کا ایک جملہ یہ تھا: للیھود دینھم وللمسلمین دینھم ۔ ایسا نہیں ہوا کہ لکھا جائے کہ للکفار دینھم وللمسلمین دینھم ۔ فتح مکہ کے بعد عرب کے مشرک قبائل کے وفود رسول اللہ سے گفت شنید کے لئے مدینہ آئے ۔ مگر یہاں بھی خطاب کا انداز یہی تھا ۔ مثلاً یمن کے لوگ مدینہ آئے تو آپ نے فرمایا کہ: اتاکم اھل الیمن ۔ اس کے بجائے آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ: اتاکم کفار الیمن ۔ اسی طرح رسول ﷺ نے اطرافِ عرب کے حکمرانوں کو دعوتی مکاتیب روانہ کئے ان کا انداز بھی یہی تھا ۔ مثلاً آپ نے رومی حکمراں کو جو خط لکھا اس کا پہلا جملہ یہ تھا: من محمد بن عبد اللہ الی ھر قل عظیم الروم ۔ اس کے بجائے آپ نے یہ نہیں لکھا کہ: الی ھرقل کافر الروم ۔ حجۃ الوداع کے خطبہ میں آپ نے صحابہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ان اللہ بعثنی کافۃ للناس فادّوا عنی ۔ اس میں بھی آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ: ان اللہ بعثنی کافۃ للکفار ۔ حضرت عمر فاروق کے زمانہ میں صحابہ کی فوج ایران میں داخل ہوئی تو روایات کے مطابق وہاں ایران کے غیر مسلم حکمراں کو خطاب کرتے ہوئے ایک صحابی نے اپنے آنے کا مقصد بتاتے ہوئے کہا: لنخرج العباد من عبادۃ العباد الی عبادۃ اللہ ۔ انہوں نے ایسا نہیں کیا کہ یہ کہیں کہ: لنخرج الکفار من عبادۃ الکفار الی عبادۃ اللہ ۔

اس طرح دوراول کے مسلمان جب عرب سے نکل کر بیرونی ملکوں میں پھیلے تو کسی بھی ملک میں انہوں نے لوگوں کو کافر یا کفار کے الفاظ سے خطاب نہیں کیا بلکہ ہر قوم کو اسی لفظ سے خطاب کیا جس لفظ کو اس نے خود اختیار کر رکھا تھا ۔ مثلاً مسیحی کو مسیحی، یہود کو یہود، مجوس کو مجوس، بودھ کو بودھ وغیرہ ۔

کافر کا تحقق اس وقت ہوتا ہے جب کہ متعلقہ شخص کے اوپر کامل اتمام حجت کیا جاچکا ہو اور اس اتمام حجت کا ماڈل صرف ایک ہے ۔ اور وہ پیغمبر اسلام کے دور میں مکہ کی تیرہ سالہ

دعوتی جدوجہد ہے۔ یہ تیرہ سالہ دعوتی عمل ہمیشہ کے لئے دعوت یا اتمام حجت کے ماڈل کی حیثیت رکھتا ہے۔ مزید یہ کہ اتمام حجت کے بعد بھی متعین طور پر کسی کے کافر ہونے کا اعلان خدا کی طرف سے ہوگا نہ کہ داعی کی طرف سے۔

قریش کی مثال

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے سال پیدائش ۵۷۰ میں ایک بڑا واقعہ ہوا۔ یمن کے عیسائی حاکم ابرہہ نے ایک بڑی فوج کے ساتھ مکہ کی طرف اقدام کیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ کعبہ کو ڈھا دے۔ مگر اللہ کی خصوصی مدد کی بنا پر اسے کامیابی نہیں ملی۔ قرآن کی سورہ نمبر ۱۰۵ میں اس تاریخی واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

۶۱۰ء جب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن نازل ہونا شروع ہوا تو نزولِ قرآن کے اس ابتدائی زمانہ میں قرآن کی سورہ نمبر ۱۰۶ اُتری۔ اس سورہ کا ترجمہ یہ ہے: اس واسطے کہ قریش مانوس ہوئے، جاڑے اور گرمی کے سفر سے مانوس۔ تو اُن کو چاہئے کہ اس گھر کے رب کی عبادت کریں جس نے ان کو بھوک میں کھانا دیا اور خوف سے ان کو امن دیا۔ (قریش ۱۔۴) اس سورہ میں قریش کو صرف قریش کہا گیا، نہ کہ کفار یا کفار قریش۔

پیغمبر اسلام توحید کے داعی تھے۔ آپ نے مکہ میں اپنی دعوت شروع کی تو مسلسل تیرہ سال تک اسی انداز میں لوگوں کو پکارتے رہے کہ اے قریش کے لوگو، اے انسانو، اے میری قوم۔ پُرامن دعوتی مہم کی اس پوری مدت میں آپ نے کبھی کافر کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ فریقِ ثانی کی طرف سے ہر قسم کی زیادتیاں کی گئیں۔ لیکن ان کیلئے آپ کی خیر خواہی کا جذبہ ختم نہیں ہوا۔ اُن کی ایذاؤں پر یک طرفہ صبر کرتے ہوئے آپ نے اپنی پُرامن دعوتی جدوجہد جاری رکھی۔ آخر کار تیرہ سال بعد قرآن میں سورہ نمبر ۱۰۹ اُتری۔ اس میں پہلی بار خدا کی طرف سے ان الفاظ میں اعلان کیا گیا کہ: قل یا ایھا الکافرون۔ (کہہ دو کہ اے انکار کرنے والو)

اس سے معلوم ہوا کہ کافر (منکر) کا لفظ ایک صفت کو بتاتا ہے، نہ کہ کسی قوم کو۔ اگر کافر سے مراد کوئی قوم ہوتی تو قرآن میں آیت کے الفاظ **لایلف قریش** کے بجائے **لایلف الکفار** ہونا چاہئے تھا اور اس کی وجہ یہی ہے کہ کافر کا لفظ صفتِ انکار کو بتانے کے لئے ہے، نہ کہ قومی تعلق کو بتانے کے لئے۔ مزید یہ کہ اس بات کا تحقق کہ کسی کے اندر صفت انکار ہے یا نہیں، قیاس کی بنیاد پر نہیں ہوگا، بلکہ حقیقی تجربہ کی بنیاد پر ہوگا۔ اور وہ تجربہ یہ ہے کہ پیغمبر کی سطح پر کم از کم تیرہ سال تک اعلیٰ ترین معیار کی دعوتی جدوجہد چلائی جائے۔ اس کے بغیر خود پیغمبر کے زمانہ میں بھی کسی کو کافر کہنا درست نہیں۔

مناظرہ

برصغیر ہند میں برٹش حکومت کے زمانہ میں اہل اسلام کے درمیان ایک مبتدعانہ رواج ظہور میں آیا جس کو مناظرہ کہا جاتا ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان دعوت کے بجائے مناظرہ بازی شروع ہوئی جس نے دونوں فرقوں کے درمیان غیر معتدل فضا پیدا کرنے کا کام کیا۔ مسلمان مناظر نے ہندو کے خلاف کتاب لکھی اور اُس کو 'کفر توڑ' کے نام سے شائع کیا۔ اس کے بعد ہندو مناظر نے مسلمانوں کے خلاف کتاب لکھی جو 'کفر توڑ کا بھانڈہ پھوڑ' کے نام سے شائع کی گئی۔

اسلام کا طریقہ دعوت ہے جو نصح (خیر خواہی) اور شفقت اور یک طرفہ صبر کے اصول پر جاری ہوتا ہے۔ جب کہ مناظرہ (debate) کا مقصد فریقِ ثانی کو شکست دینا ہوتا ہے۔ مناظر کا نشانہ فریق ثانی کو ہرانا ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ اس قسم کی زبان بولتا ہے کہ ان کے اوپر بلڈوزر چلادو:

Bulldoze them all.

اس سے دونوں گروہوں کے درمیان نفرت اور کشیدگی پیدا ہوتی ہے جو طرح طرح کے مسائل پیدا کرنے کا سبب بن جاتی ہے۔

دارالدعوہ

دار الکفر یا بلاد الکفار کے الفاظ عباسی دور میں استعمال کئے گئے۔اس سے پہلے یہ اصطلاحیں اہل اسلام کے درمیان رائج نہ تھیں۔میرے نزدیک یہ اضافہ درست نہیں۔صحیح یہ ہے کہ جو ملک اسلامی ملک ہو اس کو دار السلام کہا جائے اور بقیہ تمام ملکوں کو دار الدعوہ کہا جائے۔دار السلام کے سوا ہر ملک دار الدعوہ ہے، خواہ وہ مسلمانوں کے حق میں بظاہر دشمن ہی کیوں نہ ہو۔

قرآن میں پیغمبر اسلام کی نسبت سے ارشاد ہوا ہے: وھذا کتاب انزلنه مبرک مصدق الذی بین یدیه ولتنذرام القری ومن حولها (الانعام ۹۲)۔یعنی یہ ایک کتاب ہے جو ہم نے اُتاری ہے، برکت والی ہے، تصدیق کرنے والی اُن کی جو اس سے پہلے ہیں۔اور تاکہ تو ڈرائے ام القری کو اور اس کے آس پاس والوں کو۔

قرآن کی اس آیت میں ام القری سے مراد مکہ ہے۔جب یہ آیت اُتری، اُس وقت مکہ غیر مسلموں کے قبضہ میں تھا۔حتیٰ کہ کعبہ کو بتوں کا مرکز بنا دیا گیا تھا۔مگر اس آیت میں قدیم مکہ کو دار الکفر یا مدینة الکفر نہیں کہا گیا بلکہ ام القری کہا گیا اور وہاں انذار، بالفاظ دیگر، دعوت کا حکم دیا گیا۔اس سے مستنبط ہوتا ہے کہ وہ تمام مقامات جہاں غیر مسلموں کا غلبہ ہو وہ اسلامی اصطلاح میں دار الدعو ہ یا دار الانذار قرار پائیں گے۔ایسے کسی بھی مقام کے لئے دار الکفر یا بلاد الکفار جیسے الفاظ کا استعمال درست نہ ہوگا۔

کسی ملک کا حوالہ جب جغرافی اعتبار سے دینا ہو تو اس کا ذکر اس نام سے کیا جائے گا جس نام سے وہ عمومی طور پر معروف ہے۔مثلاً سری لنکا کو سری لنکا اور جنوبی کوریا کو جنوبی کوریا۔اور جب اہل اسلام کی ذمہ داری کے اعتبار سے کسی ملک کا حوالہ دینا ہو تو اس کو دار الدعوہ کیا جائے گا۔دارالدعوہ کا لفظ جغرافی تقسیم کو نہیں بتاتا بلکہ وہ اہل اسلام کی دعوتی ذمہ داری کو بتاتا ہے۔

کارٹون کا مسئلہ

شمالی یورپ کا ایک علاقہ ہے جس کو اسکینڈی نیویا کہتے ہیں۔اس علاقے میں چار ممالک واقع ہیں۔سویڈن، ناروے، فن لینڈ اور ڈنمارک (Denmark)۔یہاں کی آبادی میں تقریباً 2 لاکھ مسلمان ہیں۔اسکینڈی نیویا یورپ کا ایک پُر امن خطہ سمجھا جاتا رہا ہے۔مگر پچھلے چند مہینوں سے وہ برعکس انداز میں، میڈیا میں نمایاں ہو رہا ہے۔

ڈنمارک میں ڈینش (Danish) زبان لکھی اور بولی جاتی ہے۔ایک ڈینش اخبار جیلانڈس پوسٹین (Jyllands Posten) کے شمارہ ۳۰ ستمبر ۲۰۰۶ میں ایک کارٹون چھپا۔ کارٹون، جدید صحافت کا ایک لازمی حصہ ہے۔کارٹون کا مقصد نہ تعریف ہے اور نہ توہین۔ کارٹون دراصل صحافت کا ایک تفنّن آمیز جُز (Comic item) ہے۔چنانچہ عام طور پر لوگ کارٹون کو دیکھ کر یا تو اس سے محظوظ ہوتے ہیں یا سادہ طور پر اس کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔

تاہم ڈنمارک کے اخبار کا مذکورہ کارٹون مسلمانوں کے لئے سخت قابلِ اعتراض ثابت ہوا۔قصہ یہ تھا کہ اس اخبار میں ایک مضمون کے تحت کچھ کارٹون شامل کئے گئے۔ان میں پیغمبر اسلام ﷺ کا خاکہ پیش کیا گیا تھا۔مثلاً ایک کارٹون میں دکھایا گیا تھا کہ پیغمبر اسلام اپنے ہاتھ میں ایک چھری لئے ہوئے ہیں اور آپ کے سر پر ایک پگڑی ہے جس کے اوپر بم رکھا ہوا ہے۔

اس کارٹون کی خبر جب عام ہوئی تو ہر جگہ کے مسلمان اُس کو دیکھ کر یا اس کو سن کر مشتعل ہو گئے۔ان کے نزدیک یہ کارٹون پیغمبر اسلام کی توہین کے ہم معنی تھی۔جو کہ مسلمانوں کے لئے ناقابل برداشت حد تک قابلِ اعتراض ہے۔

چنانچہ ساری دنیا میں مسلمانوں نے اس کے خلاف مظاہرے شروع کر دئے۔بڑے بڑے جلوس نکالے گئے۔ڈنمارک کے سفارت خانوں میں آتش زنی اور توڑ پھوڑ ہوئی۔ان

پُرشور مظاہروں میں کئی افراد مارے گئے اور بہت سے لوگ زخمی ہوئے۔ دنیا کے مختلف حصوں میں یہ مظاہرے اتنے بڑھے کہ حکومتوں کے لئے ان پر قابو پانا مشکل ہوگیا۔ اس کے نتیجے میں جو ناخوش گوار واقعات پیش آئے ان میں سے ایک واقعہ یہ تھا کہ کئی عرب ممالک نے ڈنمارک سے اپنے سفارتی تعلقات توڑ لئے اور اس سے اپنی تجارت منقطع کردی۔

ڈنمارک، ڈیری صنعتوں کے لئے مشہور ہے۔ یہاں کی ڈیری صنعت کا تقریباً ۲۵ فیصد سامان عرب ممالک اور دیگر مسلم ممالک میں جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ڈنمارک کی کئی فیکٹریاں بند ہوگئیں اور بھاری تجارتی نقصان کی صورت میں ڈنمارک کو اس کی قیمت ادا کرنی پڑی۔ اس کے نتیجے میں ڈنمارک کو روزانہ ایک ملین ڈالر کا نقصان ہونے لگا۔

اس معاملے میں ڈنمارک اور دوسرے مغربی ملکوں کا موقف یہ ہے کہ مغربی تہذیب کے مطابق، آزادیٔ اظہار انسان کا ناقابل تنسیخ حق ہے، اور مذکورہ کارٹون کسی حق کا ایک استعمال تھا۔ اس لئے ڈنمارک کے اخبار میں مذکورہ کارٹون کی اشاعت ان کے نزدیک کوئی قابل اعتراض چیز نہیں۔ ان کے خیال کے مطابق، مسلم جذبات کے لئے وہ ایک قابل اعتراض چیز ہوسکتی ہے لیکن ڈنمارک کے لوگوں کے نزدیک وہ صرف اپنی آزادی کا ایک استعمال تھا اور ملکی قانون کے مطابق، وہ آزادی کے اس استعمال کو اپنا حق سمجھتے ہیں۔

اجتماعی معاملات میں سوچنے کے دو طریقے ہے۔ ایک، یہ کہ آئیڈیل کیا ہے اور دوسرے یہ کہ پریکٹکل طور پر کیا ممکن ہے اور کیا ممکن نہیں۔ اس معاملے میں اہل ڈنمارک کا جواب آئیڈیل کے اعتبار سے بظاہر درست ہوسکتا ہے، لیکن پریکٹکل کے اعتبار سے دیکھئے تو وہ بالکل نادرست قرار پائے گا۔ آزادی کا استعمال ایک فرد اپنے کمرے میں کرے تو اس سے کوئی اجتماعی مسئلہ پیدا نہیں ہوگا۔ لیکن جب وہ اپنی آزادی کا استعمال اجتماعی زندگے میں کرے تو

یقینی طور پر مسائل پیدا ہوں گے۔ ایسی حالت میں فرد کو یہ سوچنا چاہئے کہ کیا وہ ان منفی نتائج کا تحمل کرسکتا ہے جو آزادی کے لامحدود استعمال کی صورت میں اس کے لئے پیدا ہوں گے۔

استعمالِ آزادی کے اسی پہلو کو لے کر امریکا کے پروفیسر اسکنر (Skinner) نے کہا تھا کہ لامحدود آزادی کا تصور نہایت خطرناک ہے، ہم ایسی آزادی کا تحمل نہیں کرسکتے:

We can't afford freedom.

ڈنمارک کے لوگ روایتی طور پر امن پسند لوگ ہیں، وہ مادّی خوش حالی میں یقین رکھتے ہیں، میں نہیں سمجھتا کہ ڈنمارک کے لوگ یہ نادانی کریں گے کہ وہ اس حد تک نظریہ پرست بن جائیں گے کہ وہ اپنی آزادی کا لامحدود استعمال کرتے رہیں، خواہ اس کے نتیجے میں ان کے بین اقوامی تعلقات خراب ہوں، ان کی فیکٹریاں بند ہوجائیں۔ ان کو ناقابل تلافی حد تک تجارتی نقصان کا سامنا کرنا پڑے۔ یقیناً اب وہ اس معاملے میں اپنی پالیسی کو بدلیں گے۔ مگر فارسی شاعر کے مطابق، آدمی ایسا کام کیوں کرے جس کا نتیجہ شرمندگی ہو: کُجا کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی

اس معاملے میں مسلمانوں کو بھی اسلامی تعلیم کے مطابق، احتسابِ خویش (introspection) سے کام لینا چاہئے۔ مسلمانوں کو بھی اس معاملے میں حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے یہ سوچنا چاہئے کہ اس طرح کے معاملے میں صحیح ردِّعمل کیا ہے اور نتیجہ خیز (result oriented) تدبیر کیا ہوسکتی ہے۔

اسلامی طرزِ فکر کے مطابق، سوچنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس کو صرف ''سازش'' کی اصطلاح میں نہ سوچا جائے بلکہ زیادہ حقیقت پسندانہ انداز میں اس کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ یہاں سوچنے کی بات یہ ہے کہ مذکورہ کارٹونسٹ نے جس تصور کو اپنے خاکے میں

پیش کیا وہ تصور اس کو کہاں سے ملا۔ اگر غیر جذباتی انداز میں سوچا جائے تو خود مسلمان بھی اس میں یکساں طور پر شریک نظر آئیں گے۔

مثلاً کارٹونسٹ نے اپنے کارٹون میں دکھایا تھا کہ پیغمبر اسلام اپنے ہاتھ میں ایک چھری لئے ہوئے ہیں۔ بے لاگ انداز میں غور کیجئے تو کارٹونسٹ یہ کہہ سکتا ہے کہ مجھ کو یہ تصور مسلم شاعر ڈاکٹر محمد اقبال سے ملا۔ اقبال نے خود اپنے ایک شعر میں پیغمبر اسلام کے ماننے والوں کی تصویر ان الفاظ میں پیش کی ہے: ہر مسلماں رگِ باطل کے لئے نشتر تھا۔ اقبال کے اس مصرعے کا انگریزی ترجمہ مسٹر خوشونت سنگھ نے ان الفاظ میں کیا ہے:

To every vein of falsehood, every muslim was a knife.

اسی طرح ڈنمارک کا کارٹونسٹ یہ کہہ سکتا ہے کہ پیغمبر اسلام کو ماننے والے خود یہ کر رہے ہیں کہ اپنے جسم پر بم باندھ کر وہ اجتماعی مقامات پر جاتے ہیں اور دھماکہ کرکے وہاں بہت سے لوگوں کو ہلاک کر دیتے ہیں۔ میں نے اپنے کارٹون میں صرف یہ کیا تھا کہ بم کو جسم پر باندھنے کے بجائے اس کو سر کے اوپر رکھ دیا...... ظاہر ہے کہ اس بات کا مسلمانوں کے پاس کوئی ایسا جواب نہ ہوگا جو مذکورہ کارٹونسٹ کو مطمئن کر سکے۔

اسلام کا ایک اہم اصول یہ بھی ہے کہ مسلمان ایسا کوئی کام نہ کریں جو دوسروں کو یہ کہنے کا موقع دے کہ ہم تو وہی کر رہے ہیں جس کا نمونہ ہم تو تمہاری اپنی زندگی میں ملا تھا (ایں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند)۔ مسلمان اگر یہ چاہتے ہیں کہ کوئی شخص ان کی پُر تشدد تصویر نہ بنائے تو خود ان کو بھی اپنے آپ کو پر تشدد اعمال سے بچانا ہوگا۔ یہ ناممکن ہے کہ مسلمان ایک پر تشدد عمل کریں اور میڈیا میں جب اس کی خبر آئے تو اس کے عنوان میں تشدد کے بجائے امن لکھا ہوا ہو۔

اسی طرح اسلام اور عقل دونوں کے اعتبار سے وہی عمل صحیح عمل ہے جو اپنے انجام کے اعتبار سے مثبت نتیجے کا حامل ہو۔ ایسا اقدام جو اپنے نتیجے کے اعتبار سے کاؤنٹر پروڈکٹیو (counter productive) ثابت ہو وہ نہ اسلام کے اعتبار سے درست ہے اور نہ عقل کے اعتبار سے۔

اس اصول کی روشنی میں دیکھئے تو اقدام کا نتیجہ برعکس صورت میں برآمد ہوا ہے یعنی اسلام لوگوں کی نظر میں ایک ایسا مذہب بن گیا ہے جو آزادی کے خلاف ہے اور اپنے پیروؤں کو تشدد کی تعلیم دیتا ہے۔ حالانکہ یہ اسلام کی صحیح تصویر نہیں۔ پیغمبر اسلام کے زمانے میں مدینہ میں ایک شخص تھا جس کا نام عبداللہ بن اُبی تھا۔ وہ اسلام، پیغمبر اسلام اور اہل بیتِ رسول کے خلاف سخت سازشوں کی بنا پر اس قابل ہو چکا تھا کہ اس کو قتل کر دیا جائے مگر پیغمبر اسلام نے قصداً اس کو قتل نہیں کیا اور فرمایا کہ موجودہ حالات میں اس کا قتل اسلام کی بدنامی کا سبب بن جائے گا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ آج اس اصول کی اہمیت پہلے سے بھی زیادہ ہو چکی ہے۔ کیوں کہ پہلے بدنامی کی خبر صرف زبانی طور پر پھیل سکتی تھی مگر آج ایسی خبر پرنٹ میڈیا اور الکٹرانک میڈیا کے دور میں بجلی کی رفتار سے پھیلتی ہے۔

اس معاملے میں احتجاجات کا نتیجہ عملاً صرف معکوس صورت میں برآمد ہوا ہے اس کی ایک مثال یہ ہے کہ 30 ستمبر 2005ء کو جب یہ کارٹون ڈنمارک کے اخبار میں چھپا تو بہت تھوڑے لوگوں نے اس کو دیکھا تھا۔ مگر اس کے خلاف مسلمانوں کے پرشور احتجاج کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ کارٹون انٹرنٹ پر آ گیا۔ اور ساری دنیا میں کروڑوں لوگ اس توہین آمیز کارٹون کو انٹرنٹ پر دیکھنے لگے۔

اسلام کی تعلیمات میں سے ایک تعلیم وہ ہے جس کو اعراض (avoidance) کہا جاتا

ہے۔اعراض کا مطلب کسی ناپسندیدہ صورت حال میں ہجرِ جمیل کا طریقہ اختیار کرنا ہے۔یعنی اعلیٰ ظرفی کا وہی طریقہ جس کو تمثیل کی زبان میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

کتے بھونکتے رہتے ہیں اور ہاتھی چلتا رہتا ہے

اس معاملے میں پیغمبر اسلام کی زندگی میں ایک انوکھا نمونہ پایا جاتا ہے۔ابن اسحاق نے ایک روایت میں بتایا ہے کہ قدیم مکہ میں عرب کے مخالفین، پیغمبر اسلام کو مذمم یعنی مذمت کیا ہوا (Condemned Persons) کہتے تھے۔جب کوئی شخص آپ کے سامنے آکر آپ کو مذمم کہتا تو آپ اس کا کوئی جواب نہ دیتے بلکہ سادہ طور پر یہ فرماتے کہ ان لوگوں کو دیکھو، یہ مجھ کو مذمم بتا کر مجھ کو بُرا بھلا کہتے ہیں۔حالانکہ میرا نام تو محمد (قابل تعریف) ہے۔یعنی ان کی بُری باتیں اس شخص پر پڑیں گی جس کا نام مذمم ہو۔وہ مجھ پر پڑنے والی نہیں کیوں کہ میرا نام تو محمد ہے، مذمم نہیں۔

موجود زمانے کا ایک مسلّمہ اصول یہ ہے کہ اگر آدمی امن کے دائرے میں رہے تو وہ اپنے کسی بھی نظریے کو بلا روک ٹوک پیش کرسکتا ہے۔البتہ تشدد کا طریقہ اختیار کرتے ہی اس کی آزادی ختم ہوجاتی ہے۔مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اپنی ہر تحریک پُرامن دائرے میں رہ کر چلائیں تاکہ کوئی شخص ان کے خلاف بولنے کا موقع نہ پا سکے، خواہ کارٹون کا معاملہ ہو یا کوئی اور معاملہ۔مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ سختی کے ساتھ اپنی جدوجہد کو پُرامن طریق کار کا پابند رہتے ہوئے چلائیں۔

مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اس اہم اصول کو ہمیشہ اپنے ذہن میں رکھیں۔وہ اپنی تحریکوں کو اس بین اقوامی اصول کے مطابق چلائیں۔اس کے بعد ان کی تحریک زیادہ مؤثر ہوگی اور مزید یہ کہ اسلام اور مسلمان دونوں بدنام ہونے سے بھی بچ جائیں گے۔

ٹیلی ویژن کا استعمال

نئی دہلی کے اردو روزنامہ راشٹریہ سہارا کے شمارہ ۱۱ اگست ۲۰۰۴ء میں ایک رپورٹ چھپی ہے۔ اس رپورٹ میں ٹی وی کے بارے میں دو مختلف ''فتووں'' کا ذکر ہے۔ ایک فتوے میں کہا گیا ہے کہ تبلیغ ودعوت کے لئے ٹی وی کا استعمال جائز ہے۔ دوسرے فتوے میں اس کے برعکس یہ کہا گیا ہے کہ ٹی وی تفریح کا ذریعہ ہے جس پر فحش پروگرام پیش کئے جاتے ہیں۔ دینی پروگرام کے لئے اس کا استعمال ناجائز ہے (صفحہ ا)

اسلام کا پیغام لوگوں تک پہنچانا اور اسلام کے بارے میں غلط فہمیوں کو دور کرنا ایک ایسا کام ہے جو اہل اسلام پر فرض ہے۔ اس کو ہر دور اور ہر حال میں انجام دینا ہے۔ یہ واضح بات ہے کہ یہ کام اسی جگہ کیا جائے گا جہاں لوگ موجود ہوں یا اسی ذریعہ سے کیا جائے گا جو لوگوں تک پہنچنے والا ہو۔ کسی الگ تھلگ جزیرہ میں انفرادی طور پر یہ کام نہیں کیا جاسکتا۔ ایسی حالت میں یہ شرط لگانا کہ صرف اسی مقام پر یا اسی ذریعہ سے یہ کام کیا جائے گا جہاں کوئی بُرائی نہ ہو تو اس طرح سرے سے یہ کام ہی انجام نہ پائے گا کیوں کہ دوسرے لوگ کبھی ہماری شرطوں پر ہم کو نہیں مل سکتے۔

مثال کے طور پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ میں ۶۱۰ء میں پیغمبری ملی۔ اس وقت وہاں یہ حال تھا کہ کعبہ میں ۳۶۰ بت رکھے ہوئے تھے۔ گویا کہ کعبہ کو عملاً بت خانہ بنادیا گیا تھا۔ دوسری طرف یہ صورت حال تھی کہ اس وقت کے مکہ میں کعبہ ہی لوگوں کے لئے مقام اجتماع بنا ہوا تھا۔ مکہ کے لوگ روزانہ کعبہ کے صحن میں جمع ہوتے تھے۔ چنانچہ مکہ والوں تک دین توحید کا پیغام پہنچانے کے لئے جو قابل حصول مقام تھا وہ یہی کعبہ تھا۔ جہاں لوگ اپنے بتوں کی نسبت سے اکٹھا ہوتے تھے۔ کسی اور جگہ ان لوگوں کو پانا ممکن ہی نہ تھا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معاملہ میں ایک حکمت اختیار کی۔ آپ نے بت

کے معاملہ کو اور دعوت کے معاملہ کو ایک دوسرے سے الگ کر کے لیا۔ آپ نے اس بات کو نظر انداز کر دیا کہ جو لوگ وہاں اکھٹا ہوتے ہیں وہ بتوں کی نسبت سے اکھٹا ہوتے ہیں۔ آپ نے اس پہلو کو نظر انداز کر کے اس وقت کعبہ کو صرف مقام اجتماع کے طور پر لیا اور وہاں جا کر وہاں کے موجود لوگوں کو قرآن پڑھ کر سنانے لگے اور توحید کا پیغام دینے لگے۔ اس حکمت نبوی کو ایک لفظ میں اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ...... مسائل کو نظر انداز کرو اور مواقع کو استعمال کرو۔

یہی حکمت ہمیں ٹی وی کے معاملہ میں اختیار کرنا چاہئے۔ یعنی دوسرے غیر مطلوب پروگرام جو ٹی وی میں آتے رہتے ہیں ان کو نظر انداز کر کے اس میڈیم کے ذریعہ اپنا دینی پروگرام پیش کرنا۔ کیوں کہ ٹی وی کے عمومی رواج کی بنا پر یہ صورت حال ہے کہ ہم کو زیادہ سامعین ٹی وی ہی کے ذریعہ مل سکتے ہیں کسی اور ذریعہ سے ہمیں زیادہ سامعین نہیں ملیں گے۔

تاہم اس کا ایک اور پہلو ہے۔ اس کا تعلق ان پروگراموں سے ہے جو آج کل اسلامی پروگرام کے نام پر ٹی وی میں دکھائے جاتے ہیں۔ یہ پروگرام عملاً زیادہ مفید نہیں۔ ٹی وی کے دوسرے پروگراموں کی طرح ان اسلامی پروگراموں کو بھی تفریح کے روپ میں ڈھال دیا گیا ہے۔ یہ پروگرام بھی اسلام کے نام پر تفریحی پروگرام ہوتے ہیں۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ وہ زیادہ تر اسلامی تفریح ہوتے ہیں نہ کہ حقیقی معنوں میں اسلامی پروگرام۔

جو لوگ ٹی وی دیکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ دوسرے مذہب کے لوگ بھی اپنے مذہب کی اشاعت کے لئے ٹی وی کو استعمال کرتے ہیں۔ میری معلومات کے مطابق اس اعتبار سے سب سے اچھی مثال مسیحی پروگرام کی ہے۔ اردو اور دوسری زبانوں میں روزانہ مسیحی پروگرام آتے رہتے ہیں۔ یہ پروگرام فنی اعتبار سے ممتاز طور پر بہتر ہوتے ہیں۔

جیسا کہ معلوم ہے ہر مسلم ملک میں اسلامی پروگرام نشر کئے جاتے ہیں۔ مگر میری

معلومات کے مطابق لوگ اس کو بہت کم دیکھتے ہیں۔ غالباً اس کا سبب ان پروگراموں کا غیر معیاری ہونا ہے۔ مجھے ایک سے زیادہ بار اس کا تجربہ ہوا ہے کہ کسی مسلم ملک میں میرا جانا ہوا۔ وہاں میں نے تحقیق کی کہ وہاں کے ٹی وی پر جو اسلامی پروگرام آتے ہیں اس کو لوگ کتنا زیادہ دیکھتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ بہت کم لوگ ٹی وی کے اس اسلامی پروگرام کو دیکھتے ہیں۔ اکثر مقام پر یہ حال ہے کہ جب ٹی وی پر اسلامی پروگرام آتا ہے تو گھر والے یہ کہہ کر اس کو بند کردیتے ہیں کہ...... اس کو بند کرو، یہ تو سرکاری پروگرام ہے۔

برصغیر ہند کے تقریباً تمام مسلمان اقبال کے ساتھ گہری عقیدت رکھتے ہیں۔ مگر عجیب بات ہے کہ اقبال کا کلام ان لوگوں کے لئے صرف گنگنانے کا نغمہ ثابت ہوا ہے، نہ کہ زندگی کے لئے عملی رہنمائی لینے کا ذریعہ۔ مثلاً اقبال نے کہا تھا:

آئین نو سے ڈرنا طرز کہن پہ اڑنا   منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

مگر مسلمانوں، خاص طور پر مذہبی طبقہ کا یہ حال ہے کہ وہ ہر نئی چیز پر بھڑکتے ہیں۔ وہ ہر نئی چیز پر منفی ردعمل ظاہر کرتے ہیں۔ اسی کی ایک مثال ٹی وی ہے۔ مذہبی طبقہ کے درمیان ٹی وی کو اتنا ہی بُرا سمجھا جاتا ہے جتنا کہ شیطان کو۔

اس معاملہ میں صحیح مسلک یہ ہے کہ ٹی وی اور ٹی وی کے غلط استعمال کے درمیان فرق کیا جائے۔ ٹی وی تو ایک خدائی قدرت کا ظہور ہے۔ وہ خدا کے بنائے ہوئے فطری قانون کا استعمال ہے۔ ٹی وی کا طریقہ امکانی طور پر خود خدا کی بنائی ہوئی دنیا میں چھپا ہوا تھا۔ انسان کا حصہ اس میں صرف اتنا ہے کہ اس نے اسکو دریافت کرکے اسے استعمال کیا۔ ٹی وی کی ٹیکنالوجی اپنی حقیقت کے اعتبار سے خدا کی دین ہے نہ کہ کسی دشمن اسلام کی دین۔

یہ بات بجائے خود صحیح ہے کہ ٹی وی پر بہت سے غیر اخلاقی پروگرام آتے ہیں۔ مگر یہ ٹی وی کا غلط استعمال ہے۔ اور یہ ایک معلوم بات ہے کہ غلط استعمال ہر چیز کا ہوسکتا ہے، حتی کہ

ثابت شدہ طور پر مقدس چیزوں کا بھی۔ غلط استعمال کی بنا پر کسی چیز کو چھوڑ نہیں دیا جائے گا بلکہ اس کے استعمال کو درست کیا جائے گا۔

اس معاملہ میں مذہبی طبقہ کی ذمہ داری صرف یہ نہیں ہے کہ وہ منفی ردعمل ظاہر کر کے الگ ہو جائے۔ اس معاملہ میں مذہبی طبقہ کی ایک مثبت ذمہ داری ہے۔ اور یہ کہ ان لوگوں کو چاہئے کہ وہ ٹی وی کے طریقہ کو فنی طور پر سمجھیں۔ وہ اس کے استعمال کی تفصیلات کو جانیں۔ وہ یہ دریافت کریں کہ ٹی وی کو کس طرح اصلاحی کام کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

پھر مذہبی طبقہ کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ ضروری تیاری کے بعد ٹی وی کے لئے اعلیٰ درجہ کے اسلامی پروگرام تیار کرے، ایسا پروگرام جو لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرے۔ جس کو دیکھنے کے لئے لوگ راغب ہوں۔ جو آج کے انسان کے ذہن کو ایڈرس کرے۔

اسلام کا طریقہ منفی ردعمل کا طریقہ نہیں ہے بلکہ منفی حالات میں مثبت پہلو تلاش کرنے کا طریقہ ہے۔ اس کی ایک مثال قدیم کعبہ کی ہے جس کا اوپر ذکر ہوا۔ اصل یہ ہے کہ موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ یہاں ہر عورت اور مرد کو آزادی دی گئی ہے۔ اس لئے یہ ناممکن ہے کہ موجودہ دنیا میں سب کچھ ٹھیک رہے، کوئی ناخوشگوار بات پیش نہ آئے۔ اس دنیا میں ہمیشہ ناموافق حالات موجود رہیں گے۔ ہمارا کام یہ ہے کہ ناموافق حالات کے درمیان موافق پہلو کو دریافت کریں اور اس کو اپنے حق میں استعمال کریں۔

اس اصول کو قرآن میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: ان مع العسر یسرا۔ یعنی جہاں مسائل ہیں، وہیں مواقع بھی موجود ہیں۔ تم مسائل کو نظرانداز کرو اور مواقع کو استعمال کرو۔ یہ ایک آفاقی حکمت ہے۔ اس حکمت کا تعلق ٹی وی سے بھی ہے اور دوسری تمام چیزوں سے بھی۔

ناقابل معافی

حدیث میں آیا ہے کہ ایک لڑائی میں ایک مسلمان کے سر پر زخم آ گیا۔ وہ زخمی حالت میں تھا کہ اگلی صبح کو اسے غسل کی حاجت ہوئی۔ پانی سر پر ڈالنا سخت مہلک تھا۔ اس نے دوسرے مسلمان ساتھیوں سے مسئلہ پوچھا۔ انہوں نے کہا کہ پانی کی موجودگی میں ہم تیرے لئے کوئی گنجائش نہیں پاتے۔

مسلمان نے جب دیکھا کہ دوسری کوئی راہ نہیں ہے تو اسی حالت میں اس نے غسل کرلیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی حالت نازک ہوگئی اور وہ مرگیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس واقعہ کی خبر ہوئی تو آپ کو بے حد دکھ ہوا۔ آپ نے فرمایا قتلوہ قتلهم الله (انہوں نے اس کو ہلاک کرڈالا' خدا انہیں ہلاک کرے)۔

مذکورہ مسئلہ واضح طور پر اجتہادی تھا۔ اس کے باوجود آپ نے ان کے بارہ میں اتنے سخت الفاظ فرمائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اجتہاد میں غلطی کی معافی کی بھی ایک حد ہے۔ عام حالات میں اجتہادی خطا پر پکڑ نہیں ہے۔ مگر جب معاملہ زیاد نازک ہو جب ایسا مسئلہ درپیش ہو جس سے آدمی کی زندگی اور موت وابستہ ہو جائے تو ایسی حالت میں اجتہادی رائے پیش کرنے سے بچنا چاہئے۔ ایسے موقع پر اجتہادی رائے دینا اور اس پر اسرار کرنا بے حسی کی بات ہے اور بے حسی ایمان کی موت کی نشانی ہوتی ہے۔

اوپر کی حدیث صرف ایک ایسی اجتہادی غلطی سے متعلق ہے جس کا نقصان انفرادی سطح پر ظاہر ہوا ہو۔ پھر یہی بات مزید شدت کے ساتھ ان واقعات کے بارے میں صادق آتی ہے جب کہ کوئی قائد ملت کو ایسی اجتہادی رائے پر دوڑا دے جس کا نتیجہ ملت کے لئے اجتماعی ہلاکت کی صورت میں برآمد ہوا ہو۔

''غسل کے وقت آدمی کا رخ قبلہ کی طرف ہو یا نہ ہو'' اس مسئلہ میں مفتی اگر غلط فتویٰ دیدے تو اس میں کسی کے لئے جان و مال کے نقصان کا اندیشہ نہیں۔ مگر ایک شخص جو شدید طور پر زخمی ہے وہ غسل کرے یا نہ کرے' اس معاملہ میں غلط فتویٰ سے آدمی کی جان خطرہ میں پڑ جاتی ہے۔ اسلئے دونوں قسم کے مسائل پر غلطی کا معاملہ یکساں نہیں ہے۔ پہلی قسم کا مسئلہ وہ مسئلہ ہے جس میں اجتہادی غلطی پر بھی آدمی کو حسن نیت کا ثواب مل سکتا ہے۔ مگر دوسری قسم کے مسئلہ میں اجتہادی غلطی کرنا ناقابل معافی جرم ہے۔ نازک معاملات جنکے ساتھ فرد اور قوم کی قسمتیں ہوں' ان میں مفتی کیلئے لازم ہے کہ وہ آخر وقت تک چپ رہے۔ اور اگر بولے تو اس وقت بولے جب کہ فی الواقع وہ خدا کے سامنے اس کیلئے بری الذمہ ہو چکا ہو۔

اپنی فکر کرو

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی جنازے کے لئے نکلے۔ اس وقت حضرت عمرؓ نے فرمایا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کیا آپ اس آدمی کا نماز جنازہ پڑھائیں گے؟ کیونکہ یہ شخص فاسق ہے۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے فرمایا: ''کیا تم میں سے کوئی اس آدمی کو کسی اسلامی عمل میں دیکھا ہے؟''

ایک شخص نے کہا: ''اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں نے اس کو اللہ کی راہ میں ایک رات چوکیداری کرتے ہوئے دیکھا ہے''۔ فوراً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آدمی کی نماز جنازہ پڑھائی اور دفن کیا۔ اس کے بعد فرمایا: ''تمہارے ساتھی تم کو جہنمی تصور کرتے ہیں جبکہ میں گواہی دیتا ہوں تم جنتی ہو''۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عمرؓ سے مخاطب ہوئے اور فرمایا: اے عمرؓ اللہ تعالیٰ لوگوں کے اعمال کے بارے میں تم سے سوال نہیں کرے گا البتہ تمہارے اعمال کے بارے میں ضرور سوال کرے گا۔

شدت پسندی نہیں

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **لا تشددوا علی انفسکم فیسدد علیکم، فان قوما شددوا علی انفسھم فشدد اللہ علیھم، فتلک بقایاھم فی الصوامع والدیار** (سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب فی الحسد) یعنی تم اپنے آپ پر سختی نہ کرو ورنہ تمہاری سختی کی جائے گی۔ کیوں کہ ایک قوم نے اپنے آپ پر سختی کی۔ پھر اللہ نے بھی ان پر سختی کی۔ تو انہیں لوگوں کے باقیات ہیں گرجوں میں اور خانقاہوں میں۔

اس حدیث میں تشدد سے مراد محدود طور پر صرف مذہبی تشدد یا انتہا پسندانہ رہبانیت نہیں ہے، بلکہ اس کا تعلق انسانی زندگی کے تمام معاملات سے ہے۔ جس معاملہ میں بھی اعتدال کا طریقہ چھوڑ کر شدت کا طریقہ اختیار کیا جائے گا وہ سب اس حدیث کے حکم میں شامل ہوگا۔

اعتقادی شدت پسندی یہ ہے کہ جزوی اختلافات کی بنا پر ایک دوسرے کی تکفیر اور تفسیق کی جانے لگے۔ اسی طرح عبادتی شدت پسندی یہ ہے کہ فروعی مسالک کی بنیاد پر الگ الگ مسجدیں بنائی جائیں اور اس کو امت میں تفریق کی حد تک پہنچا دیا جائے۔ اسی طرح معاملاتی شدت پسندی یہ ہے کہ رخصت کو کم تر سمجھ کر ہر معاملہ کو عزیمت کا سوال بنا دیا جائے۔

شدت پسند آدمی اپنے آپ میں جیتا ہے۔ وہ صرف اپنی امنگوں کو جانتا ہے۔ اس بنا پر اس کی حیثیت اس انسان جیسی ہو جاتی ہے جو سڑک کو خالی سمجھ کر اس کے اوپر اپنی گاڑی

دوڑانے لگے۔ ایسا آدمی کبھی کامیابی کی منزل تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس دنیا میں کامیابی کا راز اعتدال پسندی ہے، نہ کہ شدت پسندی۔ شدت پسندی گویا خدا کی تخلیقی نقشہ کے خلاف جینے کی کوشش کرنا ہے اور اعتدال پسندی خدا کے تخلیقی نقشہ کے مطابق اپنی زندگی کی تعمیر کرنا۔ شدت پسندی اپنی ذات کے اعتبار سے تواضع کے خلاف ہے اور دوسروں کے اعتبار سے رعایتِ انسانی کے خلاف۔ اور یہ دونوں چیزیں بلاشبہ اسلام میں مطلوب نہیں۔

شدت پسندی اللہ کو پسند نہیں۔ جو لوگ شدت پسندی کی طریقہ اختیار کرتے ہیں ان کا انجام یہ ہوتا ہے کہ متشدانہ طریقہ ان کی روایات میں شامل ہو کر ان کے دین کا جزء بن جاتا ہے۔ اس طرح ان کی بعد کی نسلیں مجبور ہو جاتی ہیں کہ وہ ان کی پیروی کریں۔ کیوں کہ ایسا نہ کرنے کی صورت میں ان کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ اعلیٰ کے معیار سے کم تر درجہ کی دین داری اختیار کیے ہوئے ہیں۔

اس شدت پسندی کا تعلق محدود طور پر صرف رہبانیت سے نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق ہر دینی شعبہ سے ہے۔ مثلاً قومی اور سیاسی حقوق کی جدو جہد کے لئے دو ممکن طریقے ہیں۔ ایک پُر امن جدو جہد، اور دوسری پُر تشدد جدو جہد۔ اس معاملہ میں صحیح طریقہ یہ ہے کہ پُر امن اور غیر متشدانہ طریقہ کار کے ذریعہ اپنے مقصد کے حصول کی جدو جہد کی جائے۔ اس کے برعکس اگر متشدانہ طریقہ کار کا انداز اختیار کیا جائے تو اس کا بیک وقت دو نقصان ہوگا۔ ایک یہ کہ قوم کو غیر ضروری سختیاں برداشت کرنی پڑیں گی۔ دوسرے یہ کہ جب ایک بار متشدانہ طریقہ کار کی روایت قائم ہو جائے گی تو اسی کو جدو جہد کے اعلیٰ معیار کی حیثیت حاصل ہو جائے گی۔ متشدانہ طریقہ کار کو بے نتیجہ سمجھتے ہوئے بھی لوگ اس پر قائم رہیں گے، کیوں کہ اس سے ہٹنے کے بعد لوگوں کو محسوس ہوگا کہ انہوں نے خود دین کے مطلوب معیار کو

چھوڑ دیا۔ انہوں نے عزیمت کے بجائے رخصت کا راستہ اختیار کرلیا۔ انہوں نے اقدام کے بجائے پسپائی کو اپنا طریقہ بنالیا۔

شدت پسندی ہی کی ایک صورت وہ ہے جس کو انتہا پسندی (extremism) کہا جاتا ہے۔ انتہا پسندی یہ ہے کہ آدمی حقائق اور امکانات کو نظر انداز کر کے اپنے عمل کا نقشہ بنائے۔ وہ عقل کے بجائے اپنے جذبات کی رہنمائی میں چلنے لگے۔ وہ دور اندیشی کے بجائے عجلت پسندی کی روش اختیار کرلے۔ وہ تدریج کے بجائے چھلانگ کے ذریعہ اپنا سفر طے کرنا چاہے۔

ایسا آدمی یہ کرتا ہے کہ وہ شوق کو اپنے آگے رکھ دیتا ہے اور دور اندیشی کو اپنے پیچھے۔ وہ بھول جاتا ہے کہ ہر ایک کی ایک حد ہے، خواہ وہ کوئی فرد ہو یا کوئی گروہ۔ حد کو نظر انداز کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص جلتے ہوئے انگارے کی گرمی کا اندازہ کرنے کے لئے اس کو اپنے ہاتھ میں لے لے۔ یا پتھر کو توڑنے کے لئے اپنے سر کو ہتھوڑا بنالے۔ اس قسم کا ہر فعل حد سے تجاوز کرنا ہے۔ اور حد سے تجاوز کرنے والے لوگ اس دنیا میں کبھی کامیاب نہیں ہوسکتے۔

حوالہ جات

۱) مشکوٰۃ المصابیح
۲) الرسالہ مئی ۲۰۰۳ء
۳) الرسالہ مارچ ۱۹۸۱ء
۴) الرسالہ مئی ۱۹۸۴ء
۵) الرسالہ جنوری ۱۹۸۳ء
۶) "فتاویٰ عبداللہ بن بازؒ"
۷) الرسالہ ستمبر ۱۹۹۶ء
۸) الرسالہ ستمبر ۲۰۰۶ء
۹) الرسالہ اکتوبر ۲۰۰۷ء
۱۰) الرسالہ اپریل ۲۰۰۷ء
۱۱) الرسالہ دسمبر ۲۰۰۳ء
۱۲) الرسالہ فروری ۲۰۰۳ء
۱۳) الرسالہ دسمبر ۲۰۰۴ء
۱۴) الرسالہ مئی ۲۰۰۶ء

بے معنی مسائل کا انجام

۱۳۳۰ھ میں رشید رضا مصری ہندوستان آئے تھے۔ وہ دارالعلوم دیوبند گئے۔ وہاں ان کے خیر مقدم کے لئے ایک جلسہ ہوا۔ اس موقع پر موصوف نے دارالعلوم کے ایک استاد سے پوچھا کہ یہاں حدیث کے درس کا طریقہ کیا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ جب حدیث پڑھی جاتی ہے تو محدث پہلے اس کے علمی نکات کو بیان کرتا ہے۔ اگر بادی الرائے میں حدیث امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کے خلاف ہوتی ہے تو محدث حنفی مسلک سے اس کی مطابقت ثابت کرتا ہے۔ رشید رضا نے یہ سن کر کہا' کیا یہی تمام احادیث میں ہوتا ہے۔ کہا گیا ہاں' انہیں یہ بات بہت عجیب معلوم ہوئی۔ مولانا محمد یوسف بنوری (۱۹۰۸۔۱۹۷۷) کی روایت کے مطابق (نفحۃ العنبر' صفحہ ۱۷) انہوں نے کہا: **هل الحديث حنفي' و كيف يمكن ذلك و هل هذا الا عصبية مالها من سلطان**: کیا حدیث بھی حنفی ہے۔ ایسا کس طرح ہوسکتا ہے۔ یہ تو محض عصبیت ہے جس کے لئے کوئی دلیل نہیں۔ مولانا انور شاہ کشمیریؒ اس زمانے میں دارالعلوم میں حدیث کے استاد تھے۔ انہیں یہ خبر پہونچی تو انہوں نے اپنی خیر مقدمی تقریر میں اسی کو اپنا موضوع بنایا اور ''ثابت'' کردیا کہ تمام حدیثیں فقہ حنفی کے مطابق ہیں۔ تاہم انور شاہ کشمیریؒ کو آخر عمر میں اس طریق تعلیم کی خامی کا احساس ہوگیا تھا۔ موصوف کے شاگرد مولانا مفتی محمد شفیع (۱۸۹۷۔۱۹۷۶) ناقل ہیں کہ مولانا کشمیری نے ان سے کہا:

ہماری تمام کدو کاوش کا خلاصہ یہ رہا ہے کہ دوسرے مسلکوں پر حنفیت کی ترجیح قائم کریں مگر کیا حاصل ہے اس کا۔ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم زیادہ سے زیادہ اپنے مسلک کو صوابِ محتمل الخطاء ثابت کریں اور دوسرے مسلک کو خطاء محتمل الصواب کہیں۔ ہم تمام تر تحقیق و کاوش کے بعد یہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ صحیح ہے لیکن احتمال موجود ہے کہ یہ خطا ہو۔ اور وہ خطا ہے اس احتمال کے ساتھ کہ وہ صواب ہو۔ قبر میں منکر نکیر یہ نہیں پوچھیں گے کہ رفع یدین حق تھا یا ترک رفع یدین حق تھا۔ آمین بالجہر حق تھی یا بالسر حق تھی۔ جس چیز کو نہ دنیا میں نکھرنا ہے نہ محشر میں۔ اس کے پیچھے پڑ کر ہم نے اپنی عمر ضائع کردی۔ اور جو صحیح اسلام کی دعوت تھی' جس کی دعوت انبیائے کرام لے کر آئے تھے۔ آج وہ دعوت تو نہیں دی جارہی۔ ہم لگے ہوئے ہیں ان فروعی بحثوں میں۔ مولانا انور شاہ کشمیریؒ (۱۸۷۵۔۱۹۳۴)

(تجدید دین' صفحہ ۳۷)

اقوالِ حکمت

☆ ماضی کی تلخ یادوں کو بھلانا ہی مستقبل کی طرف کامیاب اقدام کی پہلی شرط ہے

☆ صبح ہمیشہ اپنے وقت پر آتی ہے مگر اس کو صرف جاگنے والے پاتے ہیں نہ کہ سونے والے۔

☆ جس چیز کو آپ نے اپنی نادانی سے کھو دیا' اس کو آپ ہنگامہ آرائی کے ذریعہ دوبارہ واپس نہیں لے سکتے۔

☆ ہر آدمی آپ کا دوست ہے' سوا اس شخص کے جس کو آپ خود ہی اپنا دشمن بنالیں۔

☆ ہر صبح کو جب آپ سو کر اٹھیں تو کہئے......آج کا دن میرا پہلا دن ہے۔ آج سے میں ایک نئی زندگی کا آغاز کروں گا۔

☆ نصیحت پر غصہ ہونا اور خوشامد پر خوش ہونا تمام نادانیوں میں سب سے بڑی نادانی ہے۔

☆ یاد رکھنا بہت اچھا ہے۔ مگر بعض اوقات بھلا دینا اس سے بھی زیادہ اچھا ہوتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

ایا کم والغلو فی الدین فانما ھلك من كان قبلكم بالغلو فی الدین

(النسائی، ابن ماجہ، مسند احمد)

''یعنی تم غلو سے بچو، کیوں کہ پچھلی امتیں غلو ہی کی سبب سے ہلاک ہوئیں''

تکفیر و تفسیق کا موجودہ طریقہ جو مسلمانوں میں ایک عرصہ سے رائج ہے وہ سراسر باطل ہے، شریعت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ مذموم طریقہ عباسی سلطنت کے زمانے میں رائج ہوا اور ''فرق ضالّہ'' کے نام پر وہ کئی سو سال تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ یہ نوبت آگئی کہ ان فتوؤں کے مطابق، امتِ مسلمہ میں کوئی بھی شخص مومن و مسلم کی حیثیت سے باقی نہ رہا۔ آخر کار علماء نے اتفاقِ عام کے ساتھ یہ فیصلہ کیا کہ تکفیر و تفسیق کے اس کام کو بند کر دیا جائے۔ علماء نے اتفاق رائے کے ساتھ یہ اعلان کیا کہ: لانکفر احداً من اہل القبلۃ (ہم کسی ایسے شخص کو کافر نہیں کہیں گے جو قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھے)۔